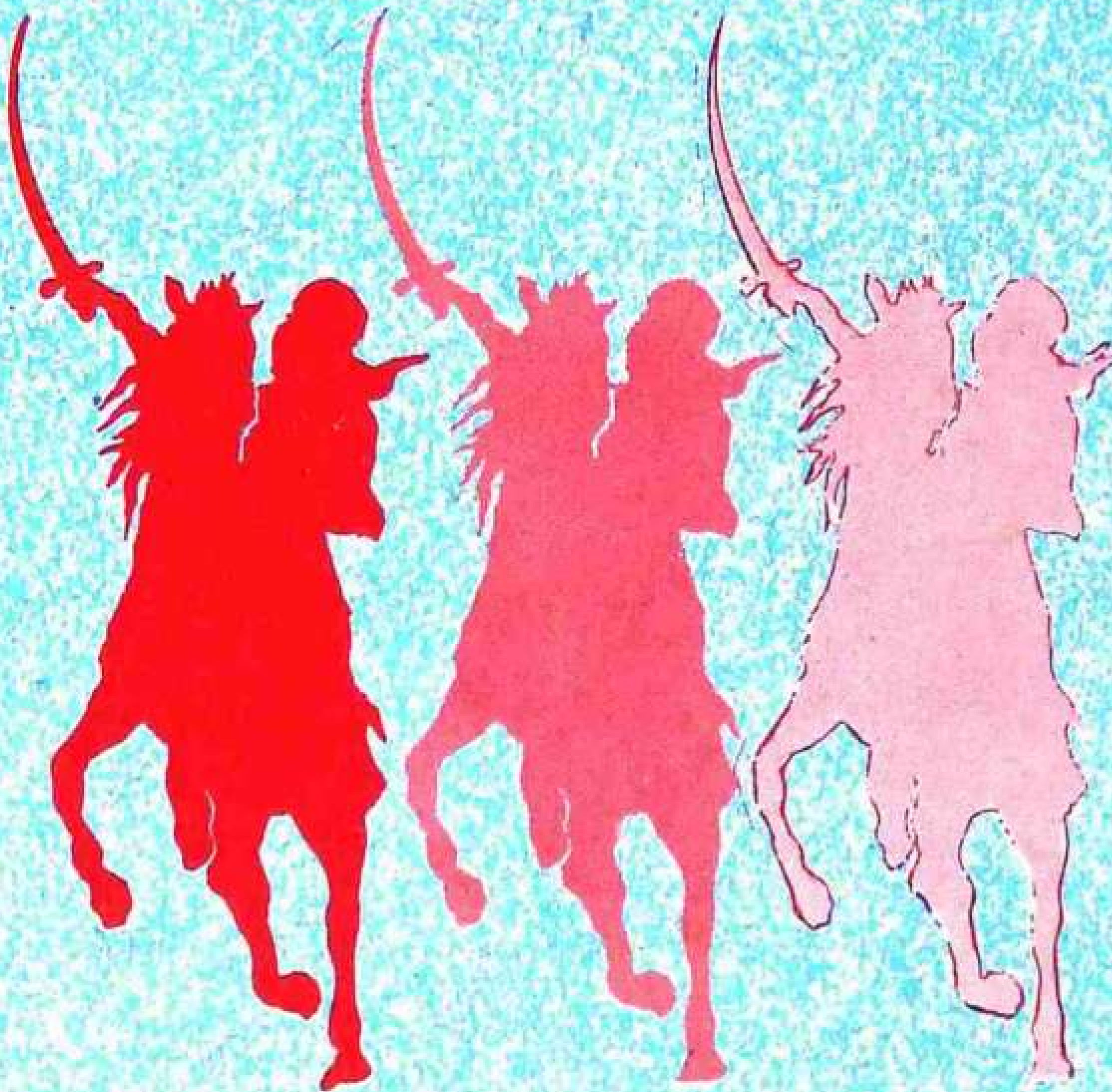
السید علی شرف الدین الموسوی علی آبادی

امریت کے خلاف ائمہ طاہرینؑ کی جدوجہد



دار الثقافۃ الاسلامیۃ پاکستان


دار الثقافة الاسلامية
۱۴۰۳ھ
کراچی پاکستان

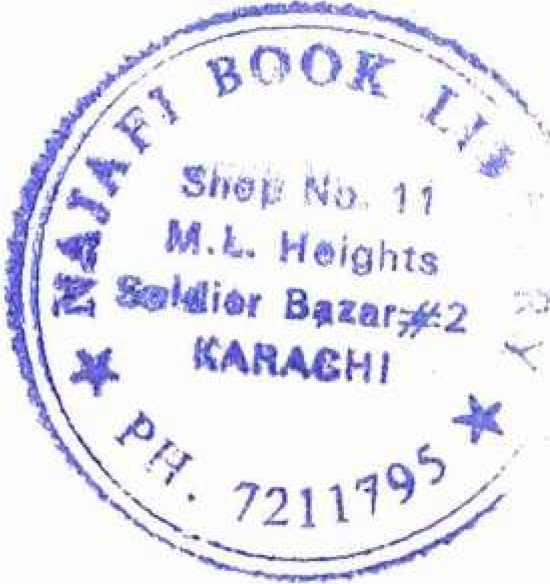


محفوظ بک ایجنسی مارٹن روڈ کراچی ۵
فون: ۳۲۳۲۸۶

آمریت کے خلاف ائمۂ طاہرینؑ کی جدوجہد

از

السید علی شرف الدین الموسوی علی آبادی



یکے از مطبوعات



دار الثقافۃ الاسلامیۃ پاکستان

۲ - بے - ۵/۴ ـــــ ناظم آباد ـــــ نمبر ۲ ـــــ کراچی

نام کتاب ـــــــــــــــــ آمریت کے خلاف ائمہؑ کی جد وجہد

تالیف ـــــــــــــــــ سید علی شرف الدین موسوی علی آبادی

ترتیب و تصحیح ـــــــــــــــ سید ابرار رضوی ۔ سید سعید حیدر زیدی

کتابت ـــــــــــــــــ سید جعفر صادق

ناشر ـــــــــــــــــ دار الثقافۃ الاسلامیہ پاکستان

تعداد اشاعت ـــــــــــــــــ ۲۰۰۰

طبع دوم ـــــــــــــــ ذی الحجہ ۱۴۱۰ھ ۔ جولائی ۱۹۹۰ء

فہرست





مقدمہ

مطالعۂ سیرتِ انبیاء و ائمہ۔ کیونکر

علومِ اسلامی میں قرآن کریم کے بعد جس میدان میں سب سے زیادہ کام ہوا ہے اور علمارِ اسلام نے جس مسئلہ پر غالباً سب سے زیادہ عرق ریزی فرمائی ہے۔ وہ تاریخ نگاری اور خصوصاً انبیاءؑ ائمہؑ اور صلحار کے حالاتِ زندگی کے بارے میں معلومات کی جمع آوری اور اصطلاح کے مطابق سیرت نویسی کا میدان ہے۔

خصوصاً پیغمبرِ اسلام حضرت محمد مصطفےٰ ص اور آپ ص کے اہلبیت علیہم السلام اور صحابہ کرام کے حالاتِ زندگی کو اس قدر محنت اور سعی و کاوش سے اکٹھا کیا گیا ہے کہ بعض اوقات تو ان محترم ہستیوں کی زندگی میں پیش آنے والے معمولی معمولی واقعات اپنی جزئیات تک کے ساتھ تاریخ و سیرت کی کتب میں ملتے ہیں۔

اسی کے ساتھ ساتھ ایسی کتب بھی کثیر تعداد میں تحریر کی گئی ہیں جن میں

انبیاء وائمہ کی ذاتی زندگی، اخلاقی خصوصیات، معاشرتی روابط، دعوتی زندگی اور جنگوں وغیرہ میں پیش آنے والے واقعات اور ان حوالوں سے ائمہؑ و انبیاء کے طرزِ عمل اور گفتار و رفتار پر تجزیہ و تحلیل کیا گیا ہے۔

زیرِ نظر سطور میں ہمارا محورِ گفتگو ائمہ علیہم السلام کی سیرت کے کسی پہلو کی تشریح و توضیح اور تجزیہ و تحلیل نہیں بلکہ چند ایسے نکات کی طرف توجہ مبذول کرانا ہے جو سیرتِ ائمہ کے مطالعہ کے وقت قاری کو ملحوظ رکھنا چاہیے تاکہ رفتار و گفتارِ ائمہؑ قاری پر واضح ہو اور سیرت کا مطالعہ کرتے وقت عموماً جو ابہامات اور اشتباہات قاری کے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں ان کو کم کیا جائے۔

سیرت کے مطالعہ سے قبل قاری پر درج ذیل نکات کا واضح ہونا ضروری ہے۔

(۱) ــــــ مطالعۂ سیرت کا مقصد۔
(۲) ــــــ سیرتِ ائمہؑ پر کن کن پہلوؤں سے گفتگو کی گئی ہے۔
(۳) ــــــ سیرت شناسی کے لیے کن چیزوں کو مدِّ نظر رکھا جائے۔
(۴) ــــــ سیرت شناسی میں حائل رکاوٹوں سے واقفیت۔
(۵) ــــــ ائمہ کا مقصد و مدعا اور ھدف

(۱) مطالعۂ سیرت کا مقصد

مطالعۂ سیرت خصوصاً انبیاء وائمہؑ کی سیرت کا مطالعہ مختلف گروہوں کے نزدیک مختلف مقاصد کا حامل رہا ہے۔

(الف) مطالعہ سیرت برائے حصول اجر و ثواب:

بشعائرِ اسلامی میں جس طرح تلاوتِ قرآن باعثِ اجر و ثواب محسوب کی جاتی ہے

اور حتیٰ کہ قرآن کی طرف نگاہ کرنا بھی ثواب میں شمار کیا گیا ہے اسی طرح انبیاء و ائمہ کی سیرت کا پڑھنا بھی باعث اجر و ثواب ہے۔

اسی بنا پر سیرت کا مطالعہ کرنے والے، سیرت پر تقاریر سننے والے اور دوسرے ذرائع سے سیرت سے آشنائی حاصل کرنے والوں کی ایک بڑی تعداد ایسے افراد پر مشتمل ہے جو یہ کام فقط اجر و ثواب آخرت کے لیے انجام دیتے ہیں۔

ایسے افراد کے نزدیک کتب سیرت کے مطالعہ کا صبر آزما کام اور سیرت سے متعلق خطابات میں شرکت کے لیے کی جانے والی تگ و دو اور سعی و کاوش فقط جزا ر آخرت کے حصول کا ذریعہ ہے اور اس کے پیچھے کوئی اور مذہبی، دینی اور اجتماعی جذبہ کار فرما نہیں۔ اس بنا پر سیرت پر تحقیق، تحلیل اور تجزیہ، ان کے نزدیک کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ نیز سیرت کے حوالہ سے کی جانے والی گفتگو کی صداقت اور صحت کی ان کے نزدیک کوئی حیثیت نہیں۔

(ب) مطالعۂ سیرت برائے مجرد معلومات

سیرتِ ائمہ سے متعلق معلومات کے حصول میں مشغول ایک گروہ ایسا بھی ہے جو یہ کام فقط معلومات کے حصول کے لیے انجام دیتا ہے۔

مطالعۂ سیرت سے اس گروہ کا مقصد صرف عظیم شخصیات کی زندگیوں سے متعلق معلومات کا حصول ہوتا ہے یا پھر یہ لوگ علوم تاریخ کے طور پر سیرت کا مطالعہ کرتے ہیں۔

(ج) مطالعۂ سیرت برائے عمل و تحریک

سیرت کا مطالعہ کرنے والوں کا وہ گروہ جو سیرت کو اپنے انفرادی اور

اجتماعی معاملات میں رہنمائی حاصل کرنے کی غرض سے پڑھتا ہے۔ درحقیقت یہی گروہ لائق ستائش اور قابل تقلید ہے۔

اس گروہ کے مطالعہ کا مقصد محض معلومات کا حصول اور عظیم شخصیات سے متعلق آگہی نہیں ہے اور نہ ہی فقط مقدس ہستیوں کے ذکر سے حاصل ہونے والا اجر وثواب ان کے پیش نظر ہے۔

بلکہ اس گروہ کے نزدیک ان ہستیوں کے عطا کردہ پیغام اور اس پیغام کی تشریح وتبلیغ میں ان کے طریقۂ کار کا علم حاصل کرنا، ان کے دیے ہوئے پیغام پر عمل کر کے اپنی دنیاوی اور اُخروی سعادت کا سامان فراہم کرنا اور ان کے پیغام کو معاشرے میں پھیلانے کے لیے لائحۂ عمل مرتب کرنا۔ سیرت کے مطالعے کا مقصد ہے۔

بالفاظِ دیگر سیرت کو پیروی کے لیے جاننا اور اس سے اپنے روزمرّہ معاملات اور اجتماعی وانفرادی فرائض کے تعین میں مدد حاصل کرنا ہی مطالعۂ سیرت کا بہترین مقصد ہے۔

سیرت ائمہؑ کی پیروی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے خداوند عالم فرماتا ہے:

"اے رسولؐ! کہہ دو اگر تم خدا کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو۔"

(سورہ آل عمران ۳ ۔ آیت نمبر ۳۱)

ایک اور مقام پر ارشاد ہے کہ:

"ابراہیم سے زیادہ خصوصیت تو ان لوگوں کو تھی جو خاص ان کی پیروی کرتے تھے (مسلمانو!) اُن

لوگوں (کے افعال) کا تمھارے واسطے، اگر خدا اور
روز آخرت کی امید رکھتے ہو، اچھا نمونہ ہے۔"

(سورہ ممتحنہ ۶۰۔ آیت نمبر ۶)

اسلامی عقائد کی رو سے بھی انبیائے کرامؑ اور ائمۂ معصومینؑ، بندوں کے لیے نمائندۂ الٰہی، رسالتِ الٰہی کے مبلغ و پاسدار اور امت اسلامی کے لیے واجب الاطاعت ہیں۔ ان کی پیروی امت اسلامی کے لیے واجب ہے۔ اسی لیے اگر کوئی مسلمان اپنی زندگی کو اسلامی اصول و ضوابط کا پابند بنانا چاہتا ہے تو اس کے لیے سیرتِ انبیاء اور سیرت ائمہ سے صرفِ نظر کرنا کسی طرح ممکن نہیں۔ اور وہ میدانِ عمل میں ثابت قدم، راست رو اور صراط مستقیم پر قائم رہ ہی نہیں سکتا جب تک کہ وہ سیرتِ ائمہ و انبیاء کو اپنے لیے نمونۂ عمل قرار نہ دے دے۔

اس مختصر بحث کے بعد قارئین کے لیے اب یہ بات غیر واضح اور مبہم نہیں رہی ہو گی کہ سیرت کے مطالعے کا مقصد پیروی اور اطاعت ائمہ میں مدد حاصل کرنا ہونا چاہیے۔

(۲) سیرتِ ائمہؑ پر کن کن پہلوؤں سے گفتگو کی گئی ہے۔!

اگر ہم کتب سیرت کا جائزہ لیں تو ہمیں سیرتِ ائمہ کے حوالے سے مختلف پیرایوں میں لکھی گئی کتابیں نظر آئیں گی ان کو ہم مختلف عنوانات کے تحت بیان کریں گے:

سیرتِ نقلی

اس عنوان کے تحت ایسی کتابیں آتی ہیں جن میں ائمہ علیہم السلام کی زندگی

میں پیش آنے والے مختلف واقعات، پیدائش، وفات، ازواج واولاد کے متعلق معلومات، آپ کے ہم عصر حکمرانوں سے سلوک اور اجتماعی وانفرادی زندگی سے متعلق دیگر تفاصیل شامل ہیں۔

تاریخ وسیرت کے حوالے سے یہ معلومات ایک خام مواد کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ معلومات جتنی موثق، معتبر اور واضح ہوں گی اتنا ہی سیرت و تاریخ کو سمجھنا آسان ہوگا اور یہ معلومات ائمہ کے گفتار و کردار کا تجزیہ و تحلیل کرنے میں مددگار ثابت ہوں گی۔

اسی بنا پر ان واقعات کی صحت اور ان کے معتبر ہونے کے سلسلے میں تحقیق و تدقیق کے دروازے کھلے رہنے چاہئیں۔

سیرت نقلی ہی سیرت شناسی کی بنیاد ہے۔ اس بنا پر اگر یہ بنیاد ہی کمزور ہوگی تو اس پر کھڑی کی گئی عمارت باد مخالف کے معمولی جھونکے ہی سے گر جائے گی۔

سیرتِ تحلیلی

سیرتِ تحلیلی کی کتب، سیرتِ نقلی سے حاصل شدہ مواد پر تجزیہ، تحلیل اور تحقیق پر مبنی ہوتی ہیں۔ ان کتب میں کچھ خاص واقعات کو عنوان قرار دے کر ان حوالوں سے ائمہ کے کردار و رفتار پر بحث و تمحیص کی جاتی ہے۔ مثلاً تاریخ اسلام کی کتب میں ہر دور میں عموماً صلح حدیبیہ، صلح امام حسنؑ اور قیام امام حسینؑ پر تجزیہ و تحلیل کیا گیا ہے۔

سیرتِ موضوعی یا سیرتِ نوعی

کسی ایک مخصوص عنوان اور خاص موضوع پر تمام ائمہ کے رفتار و گفتار

سے نتیجہ اخذ کرنے کے لیے جو تجزیہ و تحلیل کی جائے وہ سیرت نوعی یا سیرت موضوعی کہلاتی ہے۔ سیرت موضوعی یا سیرتِ نوعی کو ایک مثال کی مدد سے واضح کرتے ہیں:

آیاتِ قرآنی اور احادیث و روایاتِ رسولؐ کی رو سے رسول اکرم حضرت محمد مصطفیٰؐ کے بعد ائمہ معصومینؑ ہی اقتدار کے حقیقی وارث اور حقدار تھے۔ لیکن یہ تاریخی حقیقت بھی روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ بعد وفاتِ رسولؐ مسندِ اقتدار پر دوسرے زبردستی قابض ہوگئے اور یہ انحراف آخر کار یہاں تک پہنچا کہ امت پر یزید جیسے بدکردار اور فاسق و فاجر حکمراں مسلط ہوتے رہے۔

اس پس منظر کے ساتھ ہم تاریخ کی ورق گردانی کرتے ہیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ کہیں ائمہ ان حکمرانوں کے مقابل سکوت اور خاموشی اختیار کرتے ہیں اور بعض مشکل مواقع پر ان سے تعاون کرتے ہوئے بھی نظر آتے ہیں (حضرت علیؑ کی روش خلفاء ثلاثہ کے ساتھ) اس کے برعکس کبھی ان ظالموں کے خلاف شمشیر بکف اور ہر صورت میں ان کی نابودی کے خواہاں اور ان سے مقابلہ پر کمربستہ نظر آتے ہیں (حضرت علیؑ اور معاویہ، امام حسنؑ اور معاویہ اور یزید اور امام حسینؑ کے مابین جنگ کی مثالیں تاریخ کا حصہ ہیں)

اس کے بعد جب ہم تاریخ کے اوراق کو الٹتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ایک طرف تو ائمہ بظاہر سیاست سے لاتعلق اور کنارہ کش نظر آتے ہیں اور دوسری طرف اس کے برعکس حکمرانوں کی قائم کردہ عدالتوں کے بائیکاٹ جیسے سیاسی عمل کی ترغیب دیتے ہیں اور کبھی اصحاب کو ان حکومتوں میں شامل ہونے کی اجازت دیتے ہیں اور کبھی خود حکومت میں شامل ہوتے ہیں (امام رضاؑ کا مامون کے ولی عہد کی صورت میں تقرر)۔

تاریخ کا طالب علم مطالعہ کے دوران جب ائمہ کرامؑ کے ان متفاوت

اور ایک حد تک متضاد طرز ہائے عمل کا مشاہدہ کرتا ہے تو شدید ذہنی الجھن اور تذبذب کا شکار ہو جاتا ہے اور خصوصاً اس وقت یہ اضطراب دوچند ہوتا ہے جب کوئی طالب علم اس عقیدہ کا حامل ہو کہ تمام ائمہ معصوم ہیں اور ان سے خطا اور لغزش کا ذرہ برابر بھی امکان نہیں۔

سیرتِ موضوعی کا مطالعہ اس اضطراب کو ختم کرنے کا بھی ذریعہ ہے اس طریقہ سے سیرت کا مطالعہ کرتے وقت ہم تمام ائمہؑ کے زمان و مکان نیز ہر امامؑ کے دور میں امت کی معاشرتی، معاشی، ثقافتی اور فکری سطح نیز حاکم وقت کے رویہ، اس کی قوت و طاقت اور معاشرہ پر اس کی گرفت کا بھی بغور مطالعہ کرتے ہیں۔

ان تمام امور کے مطالعے کے بعد ہمیں ائمہؑ کے طرز عمل میں ظاہری تضاد کی صحیح وجہ کا علم ہوتا ہے اور یہ بات بھی پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ ہمارے تمام ائمہؑ ایک ہی نکتہ نظر اور نظریۂ فکر کے حامل تھے۔ تمام ائمہؑ کا ایک ہی موقف تھا اور آپ حضرات علیہم السلام میں سے کوئی بھی کسی بھی وقت اپنے موقف سے ایک لحظہ یا رتی برابر بھی پیچھے نہیں ہٹا۔

سیرت کے اس طرح سے مطالعہ سے جہاں ایک طرف ائمہؑ کی روش میں نظر آنے والے تضاد کا حل ملتا ہے تو دوسری طرف مختلف مسائل میں آئین اسلام کے اصول و ضوابط کا علم بھی ہوتا ہے۔

(۳) سیرت شناسی کے لیے کن چیزوں کو مدنظر رکھا جائے

سیرتِ ائمہ کا مطالعہ کرتے وقت ایک اہم بات جو پیش نظر رہنی چاہیے خصوصاً وہ حضرات کہ جو مقصدِ ائمہؑ کے مبلغ ہیں اور تعلیماتِ ائمہ کو معاشرہ میں رائج

اور نافذ کرنے کا عزم رکھتے ہیں انھیں اس امر پر خصوصی توجہ مرکوز رکھنی چاہیئے) وہ ائمہ طاہرینؑ کا اپنے اھداف کی تکمیل کے لیے لائحۂ عمل ہے۔

تبلیغ دعوتِ حق اور پیغامِ دینِ مبین کو عام کرنے اور اس کو معاشرہ میں رائج کرنے کی غرض سے ائمہ نے اپنے لائحۂ عمل کو مختلف مراحل میں تقسیم کیا ہے۔ انبیاء نے اپنے لائحۂ عمل کے ان مراحل کو کبھی تو یکے بعد دیگرے اور کبھی ان تمام مراحل کو ساتھ ساتھ انجام دیا ہے۔

یہاں ہم ان مراحل کو الگ الگ بیان کرتے ہیں:

الف:۔ اس مرحلہ کا آغاز ابتدائے تبلیغ سے ہوتا ہے۔ اس دور میں انبیاء وائمہ دعوت کا آغاز کرتے ہیں اور لوگوں کو جمع کر کے ان کے نظریات، افکار اور اعمال کو ایک خاص فکری بنیاد پر استوار کرتے ہیں تاکہ ان ممتاز و مخصوص افراد کے ذریعہ دعوت و تبلیغ کے امور کو خوش اسلوبی اور نظم و ضبط کے ساتھ انجام دیا جائے۔

ب:۔ اس مرحلہ میں دعوت و تبلیغ کو عام کرنا اور معاشرے میں اس کے رواج و نفاذ کے لیے جدوجہد اور مبارزہ شامل ہے۔ اس مبارزہ وجہاد کے نتیجے میں کامیابی کے بعد ائمہ ایک خطہ میں اسلامی معاشرہ قائم کرتے ہیں جس کا انتظام و انصرام شریعت کی فراہم کردہ ہدایات و قوانین کے تابع ہوتا ہے۔

سیرت شناسی کے لیے ان مراحل کا کامل ادراک اور ان مراحل کی انجام دہی کے لیے ائمہ کے طریقۂ کار کو سمجھنا ایک ضروری اور لازمی امر ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر

سیرتِ ائمہ کے اجتماعی پہلو کو سمجھنا محال ہے۔

(۴) سیرت شناسی میں حائل رکاوٹوں سے واقفیت

سیرت شناسی اور ائمہؑ کے کردار و عمل سے کما حقہٗ آگاہی کے لیے ان رکاوٹوں سے واقفیت بھی لازمی ہے جو ائمہؑ کے کردار، ان کے مقاصد اور اس راہ میں آپؑ حضرات کے لائحہ عمل کو سمجھنے میں حائل ہیں۔

ان میں سے چند اہم رکاوٹوں کو ہم ذیل میں مختصراً بیان کریں گے :

(۱) ——— معاشرے کے ترقی و تکامل اور تنزل و بدبختی میں افراد کے کردار سے مفر نہیں ہے کیونکہ معاشرہ اور اجتماع بہرحال افراد کی اکائیوں پر مشتمل ہے۔ اگر معاشرے کے افراد باعمل، تیز رو اور عمدہ خصلتوں کے مالک ہوں گے تو اس بنا پر معاشرہ بھی ترقی، تکامل اور بلند مراتب کی جانب گامزن ہوگا۔

اس کے برعکس اگر معاشرے کے افراد بے عمل، سست رو، کاہل اور بری خصلتوں کے مالک ہوں تو معاشرہ بھی تنزل اور پستی کی جانب مائل ہوگا۔

آیا انبیائے کرامؑ اور ائمہ طاہرینؑ نے بھی اپنے مبارزات اور تشکیلات میں اس اصول کو ملحوظ رکھا ہے۔ انھوں نے امت کی مجموعی حالت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنے اقدامات تجویز کیے ہیں یا پھر ائمہؑ نے اس اصول کو پس پشت ڈال کر امت کی فکری و عملی روش کو نظر انداز کرتے ہوئے اقدامات کا آغاز و اعلان کیا ؟

مطالعۂ سیرت کے وقت ان باتوں کو ہم نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اسی بنا پر ہمارے لیے سیرتِ ائمہؑ، خصوصاً ان کے اجتماعی معاملات میں کیے گئے اقدامات کو

سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے۔

مطالعۂ سیرتِ ائمہ کے ذیل میں امت اور طاغوت کے کردار و روش کو مدنظر رکھتے وقت امت کے مختلف طبقات کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں امت کے ان طبقات کا تذکرہ کر دیا جائے تاکہ ایک طرف تو یہ معلومات، ائمہ کے کردار و عمل کو سمجھنے میں ممد و معاون ثابت ہوں اور دوسری طرف خود ہمارے افکار و اعمال کی درستگی کا ذریعہ ہوں ۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ہم طاغوت کے رویہ اور طریق کار پر بھی روشنی ڈالیں گے :

الف :۔ یہاں ہم اپنی بحث کے حوالہ سے امت کو تین بڑے حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ ان تین بڑے حصوں میں بھی مختلف درجات کے لوگ پائے جاتے ہیں :

ہمراہیانِ طاغوت

ہر دور میں امتِ مسلمہ کا ایک گروہ، طاغوتِ دوراں کے ہمراہ و ہم رکاب رہا ہے۔ اس جماعت میں مختلف انداز فکر وجود رکھتے ہیں۔ کچھ لوگ تو ایسے ہوتے ہیں جو دلی طور پر ہیئت حکمراں کے خیر خواہ اور مطیع و فرمانبردار ہوتے ہیں۔ اس خیر خواہی اور اطاعت کی وجوہات کی مختلف توجیہات اور تاویلات کی جا سکتی ہیں۔ اس مختصر تحریر میں اس تفصیل کی گنجائش نہیں پائی جاتی۔

طاغوت کے ہمراہیوں کا ایک حصہ بلکہ بلا مبالغہ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ایک بڑا حصہ حکمران طبقہ کی طاقت و قدرت اور ہیبت و جبر کی وجہ سے اس کا ہمراہی ہو جاتا ہے۔

ہمراہیانِ امامؑ

ائمہ کے ہمراہیوں کی تعداد مختلف ادوار میں کمی و بیشی کا شکار رہی ہے فی الحال اس کمی و بیشی کے محرکات و وجوہات کو نظر انداز کرتے ہوئے ہم ان افراد کے مختلف درجات کا تذکرہ کریں گے :

حق شناس مخلص و مبارز اصحاب

ائمہ کے ہمراہیوں میں ایک گروہ تو ائمہ کے حقیقی جاں نثاروں اور فداکاروں کا رہا ہے جو پوری معرفت، کامل یقین اور اپنی پوری استعداد اور طاقت و قدرت کے ساتھ ائمہ کے ہمراہ رہا اور بیش بہا اور گراں مایہ قربانیاں پیش کرتا رہا۔ منجملہ ان افراد میں ابوذر، عمار، سلمان، مقداد، مالک اشتر، میثم تمار، رشید ہجری، حجر ابن عدی وغیرہ سر فہرست ہیں۔

یہ مقدس ہستیاں ہر دم امیر المومنین کے ہمراہ رہیں اور نہایت مشکل حالات اور سخت شکنجوں کے باوجود ایک لمحہ کے لیے بھی اپنے موقف سے دستبردار نہیں ہوئیں۔

حق شناس اصحاب

ائمہ کا ساتھ دینے والوں میں سے کچھ لوگ ایسے تھے کہ جو ائمہ کے حقیقی مقام و منزلت سے تو پوری طرح آشنا تھے یہاں تک کہ ائمہ کے حقدار قیادت و خلافت ہونے کے بھی قائل تھے اور ان کا یہ فیصلہ پوری معرفت اور کامل ادراک کے ساتھ تھا لیکن اس حق کے حصول کے لیے

دی جانے والی قربانیوں اور اٹھائی جانے والی مشکلات کے مقابل ثابت قدم نہ رہ سکے اور جائے پناہ اختیار کی۔ لیکن جوں ہی ان کے خیال کے مطابق یہ مشکلات برطرف ہوئیں اور طاغوت سے مقابلہ کے حالات سازگار ہوئے یہ افراد میدانِ عمل میں حاضر ہو کر طاغوت سے برسرپیکار ہوئے جیسے اہالیانِ کوفہ اور انہیں سے سلیمان ابن صرد خزاعی وغیرہ جنھوں نے امام حسینؑ کو کوفہ آمد کی دعوت دی حضرت مسلم بن عقیلؑ کی کوفہ میں تائید و حمایت کی لیکن عبید اللہ ابن زیاد جیسے سخت گیر امیر کے سامنے استقامت نہ دکھا سکے لیکن امام حسینؑ کی شہادت کے بعد پشیمان ہوئے اور جیسے "توابین" کہ جو واقعہ کربلا کے بعد یزیدی حکومت سے برسرپیکار ہوئے۔

مفادات و مصلحتوں کے اسیر ہمراہی

بعض لوگ اپنے ذاتی مفادات، قبیلائی تعصب، وقتی مصلحتوں اور دنیاوی اقتدار کی غرض سے بھی ائمہ کے ہم رکاب ہوئے۔ جیسے معاویہ کے مقابل امام حسنؑ کی فوج کے اکثر سردار کہ جو اقتدار اور زر و جواہر کے لالچ میں معاویہ سے جا ملے اور امامؑ کو صلح کا تلخ جام پینا پڑا۔ اور خوارج کہ جو معاویہ کی طاقت و حکومت کو ختم کرنے کے لیے امام حسنؑ کے ہمراہ ہوئے لیکن جوں ہی امام حسنؑ کو کمزور پڑتے ہوئے پایا فوراً امامؑ کے خلاف بغاوت کی۔

غیر جانبدار گروہ

ہر دور میں ہمراہیانِ امامؑ اور طاغوت کے ساتھیوں کے علاوہ ایک تیسرا گروہ بھی موجود رہا ہے جو غیر جانبدار افراد پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہ گروہ اپنی کوئی

رائے اور سمت نہیں رکھتا اور ہوا کے زور پر اپنی سمت و رویہ کا تعین کرتا ہے۔ جیسے اہل کوفہ کا ایک گروہ کہ جس نے حضرت مسلم بن عقیل کی کوفہ آمد کے موقع پر اہلِ کوفہ کے جوش و خروش اور حضرت کے پرجوش استقبال کے پیش نظر حضرت مسلم اور امام حسینؑ کی حمایت کا فیصلہ کیا لیکن جوں ہی اہل کوفہ کا جوش و خروش ٹھنڈا ہوا اور لوگ حضرت مسلم سے دور ہوئے، انھوں نے بھی اپنا رخ تبدیل کر دیا۔ اور اپنے ساتھیوں کو یہ کہتے ہوئے کہ :

" ہماری کیا حیثیت کہ ہم حکومت و سیاست کے معاملات میں ٹانگ اڑائیں ۔"

حضرت سے جدا کیا اور گوشہ نشین ہو گئے۔

سیرت ائمہ کے اجتماعی اور سیاسی پہلو کا مطالعہ کرنے والے قارئین کے لیے ہر دور میں ان تینوں گروہوں کی کمیت اور کیفیت سے شناسائی ایک لازمی امر ہے۔ بصورتِ دیگر کسی امامؑ کی سیرت کے بارے میں فیصلہ کرنا نادرست ہوگا۔

ب :— ایک اور بات جو سیرتِ ائمہ کے اجتماعی و سیاسی پہلو کے مطالعہ سے درست نتائج اخذ کرنے کے لیے ضروری ہے وہ ائمہؑ کے ادوار کے طواغیت کے اسلام اور شعائرِ اسلامی کے ساتھ ربط و تعلق سے شناسائی حاصل کرنا ہے ۔

اس سلسلے میں جو بات پیش نظر رہے وہ یہ کہ جس زمانہ میں امام کے سیاسی و اجتماعی اقدامات کا مطالعہ پیش نظر ہے اس دور کے طاغوت کا اسلام کے ساتھ کیسا ربط و تعلق تھا ۔

آیا وہ عوام میں ظاہری طور پر اسلام پرست اور دیندار مشہور تھا

یعنی آیا اس نے چند ظاہری اسلامی شعائر پر عمل پیرا ہو کر اور دین کا نقاب اوڑھ کر عوام کو دھوکے میں رکھا ہوا ہے یا کھلم کھلا شعائر دینی کا مذاق اڑاتا ہے۔ اور عوام الناس اس کی بے راہ روی اور دین سے اس کے سلوک سے آشنا ہیں۔ نیز اس نے ائمہؑ کے ساتھ اپنی جنگ کو کیا عنوان دیا ہے۔

ان صورتوں میں ائمہؑ کے مبارزہ کا طریقۂ کار مختلف تھا۔

پہلی صورت میں ائمہ نے طاغوت سے براہ راست مقابلہ کرنے کی بجائے امت کو دین کے حقیقی پہلوؤں اور طاغوت کے خلافِ اسلام اقدامات اور دین میں کی جانے والی تحریف سے آگاہ و آشنا کیا۔ اس طرح طاغوت کے چہرے سے دین کا نقاب اتارنا مقصود تھا تاکہ معصوم و کم فہم عوام اس کے فریب کے جال سے باہر نکل آئیں۔ کیونکہ اس دینی نقاب کے اتارے بغیر اس طاغوت کے خلاف اعلان جہاد کی صورت میں سخت مشکلات درپیش تھیں۔

جناب امیرالمومنین حضرت علی ابن ابی طالبؑ، خوارج سے جنگ کے موقع پر ایسی ہی مشکل کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اے لوگو! میں نے فتنہ و شر کی آنکھیں پھوڑ ڈالی ہیں۔ اور جب اس کی تاریکیاں تہ و بالا ہو رہی تھیں اور اس کی دیوانگی زوروں پر تھی، تو میرے علاوہ کسی میں بھی جرأت نہ تھی کہ وہ اس کی طرف بڑھتا۔"

کیونکہ خوارج بظاہر نماز، روزہ اور دیگر شعائر اسلامی کے پابند تھے اور ان کی حضرت علیؑ کے خلاف چھیڑی گئی جنگ کا عنوان بھی دین کا تحفظ تھا۔ اس بنا پر سادہ لوح مسلمان عوام کو یہ باور کرانا نہایت مشکل تھا کہ حق کس جانب ہے۔

دوسری صورت میں یعنی جب طاغوت کھلم کھلا بے دینی کا اظہار کرتا ہو

اور اس کی لادینیت عوام الناس سے پوشیدہ نہ ہو تو ایسی صورت میں ائمہ کا رویہ پہلے رویہ سے مختلف تھا۔ اور اس کے خلاف کھلم کھلا جہاد کیا گیا۔ جیسے یزید کی کھلم کھلا لادینیت اور شعائر اسلامی کی ببانگ دہل مخالفت اور عوام کی اس سے آگاہی کی بنا پر امام حسینؑ کا اس کے خلاف اعلانِ جہاد۔

امامؑ جب یزید کے خلاف اٹھے تو بقول مولانا مودودی کسی صحابی، تابعین اور علماء نے یہ نہیں کہا کہ یزید کے خلاف اٹھنا حرام ہے۔ گویا ایسی جعلی روایات بھی تھیں جو کہتی تھیں کہ حاکم وقت کے خلاف جنگ حرام ہے۔ بلکہ یہ کہا کہ آپ نہ جائیں کیونکہ آپ کامیاب نہ ہوں گے۔

جبکہ حضرت علیؑ اور امام حسنؑ کی معاویہ کے خلاف جنگ کے موقع پر خود لشکر امامؑ میں شریک افراد شکوک و شبہات کا شکار تھے۔

(۲) ـــــــ ائمہ علیہم السلام کی وہ روایات بھی سیرت شناسی میں رکاوٹ بنتی ہیں جو تقیہ کے عالم میں یا رازوں کو چھپانے کے مواقع پر وارد ہوئی ہیں اور جو سیاق و سباق اور موقع کی صحیح صورتحال معلوم کیے بغیر ہم تک پہنچی ہیں۔

(۳) ـــــــ امت کے درمیان ائمہ کے حقیقی کردار اور مسئولیت و ذمہ داری سے عدم واقفیت بھی اس بات کا سبب ہے کہ ہم سیرت کو صحیح طریقے پر سمجھنے سے قاصر ہیں۔

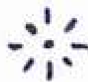
(۴) ـــــــ قدیم تاریخ میں پیش آنے والی پیچیدگیاں اور اس دور کے سیاسی، ثقافتی، سماجی، اقتصادی اور اجتماعی نظریات اور رسوم و رواج سے عدم واقفیت بھی ائمہ کے کردار و عمل سے درست نتیجہ اخذ کرنے میں مانع ہے۔

(۵) —— سیرت ائمہ میں مطالعے کے لیے درکار خام مواد یعنی تاریخی اسناد وغیرہ میں ائمہ کے دشمنوں کی جانب سے آمیزش اور ملاوٹ کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ مستشرقین کی جانب سے ٹھونسے گئے غیر اسلامی نظریات بھی سیرت ائمہ کو سمجھنے میں مانع ہیں۔

(۵) ائمہ کا مقصد و مدّعا اور ھدف

سیرتِ ائمہ کو سمجھنے میں ہماری نظر میں ایک اور بڑی رکاوٹ ائمہ کے ھدف و مقصد سے ناآشنائی ہے۔ اور افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ زیادہ تر افرادِ امّت اس لاعلمی میں مبتلا ہیں۔ اسی بنا پر سیرتِ ائمہ مبہم ہے اور اشتباہات کا شکار ہے۔

ہم نہایت ذمّہ داری کے ساتھ عرض کرتے ہیں کہ عموماً افرادِ امّت کے نزدیک یہ امر بھی پُر اشتباہ اور مشتبہ ہے کہ آیا ائمہ طاہرینؑ فقط تسبیح و تہلیل تذکار و تالیف اور تعلیم و تبلیغ پر مامور ہیں یا ان مقدس ہستیوں کی کچھ اجتماعی اور سماجی ذمّہ داریاں بھی ہیں۔ اور ظلم و ظالمین کے خلاف جہاد اور قیادت و سیادتِ امت بھی ان کی بنیادی ذمہ داریوں میں شامل ہے ؟!



زیرِ نظر کتاب ہم نے سیرتِ موضوعی کے طریقہ پر تالیف کی ہے اور اس میں ائمہ طاہرینؑ کے آمریت، طاغوت اور اس دور کے حکمرانوں کے ساتھ جہاد کو موضوعِ گفتگو بنایا گیا ہے۔

امید ہے کہ اہل فکر و دانش اور علماء ذوی الاحترام کتاب سے متعلق اپنی تجویز و تنقید سے مستفید فرمائیں گے۔

آمریت کی تعریف اور اسکے اسباب

آمر اور طاغوت دونوں ایک ہی مفہوم اور ایک ہی معنی کے حامل الفاظ ہیں اور وہ معنی ہے

" عقل و شرع کے مقرر کردہ حدود سے تجاوز کرنے والا۔"

لہٰذا طاغوت، آمر ـــــ ظالم و جابران سرکش انسانوں اور حکومتوں کو کہا جاتا ہے جو خدا کی طرف سے عائد احکامات اور الٰہی قوانین سے سرکشی کے مرتکب ہوتے ہیں اور اپنے آپ کو ہر قانون کی پابندی اور حدود و قیود کے احترام سے آزاد تصوّر کرتے ہیں۔

چنانچہ ہر وہ شخص جو غیر خدا کی پرستش کرتا ہے وہ صرف حکم خدا اور شریعت الٰہی ہی سے تجاوز نہیں کرتا بلکہ وہ عقل و فطرت سے بھی انحراف کا مرتکب

ہوتا ہے کیونکہ عقل و فطرتِ انسانی بھی اوامرِ الٰہی کو تسلیم کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔

لہٰذا ہر وہ شخص جو آئین و قانون اور حاکمیتِ خدا کا قائل نہیں وہ طاغی ہے اور ہر وہ شخص جو خدا کی حاکمیت کے بجائے اپنی حاکمیت کا قائل ہو اور احکامِ خدا کی پیروی کرنے کی بجائے اپنے خودساختہ آئین و قوانین کا پیرو ہو اور اسی کی دعوت دوسرے لوگوں کو دیتا ہو۔ وہ طاغوت ہے۔

قرآن کریم نے آٹھ مرتبہ لفظ طاغوت کی تکرار کی ہے۔ ایمان باللہ کے لازمی معنی ہی طاغوت کا انکار ہے۔ طاغوت اور طاغوت کی پرستش کرنے والوں کے لیے خداوند ذوالجلال نے آخرت میں دردناک عذاب کی وعید کی ہے۔

خداوندِ عالم قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے کہ:

" بالتحقیق انسان اس وقت طغیان کرتا ہے جب
وہ اپنے آپ کو بے نیاز اور غیر محتاج سمجھتا ہے"

آمریت کا تصور انسان میں اس وقت آیا جب اس نے اپنے آپ کو ہر قسم کی قید و بند سے آزاد دیکھا اور اپنے آپ کو نہ کسی آئین و دستور اور نہ کسی قوم و ملت کے سامنے اور نہ خدائے وحدہٗ لاشریک کے سامنے جواب دہ سمجھا — — یہ سوچ جتنی اس کے اندر بڑھتی گئی اتنی ہی آمریت قوت پکڑتی گئی۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے طاغوت کی تفسیر میں بنی امیہ کے ظالم و جابر حکام کی طرف نشاندہی کی ہے۔

ہمارا موضوع دو جملوں پر مشتمل ہے:

" آمریت " ——— اور ——— " اس کے خلاف
ائمۂ اطہار علیہم السلام کا جہاد"

آمریت، مطلق العنان، ظلم و استکبار، غیر قانونی، غیر جمہوری اور

ڈکٹیٹرانہ نظاموں پر مبنی حکمرانی کو کہا جاتا ہے۔

صفتِ آمریت مادر زاد صفت نہیں جو حکمرانوں یا مقتدر افراد میں ان کی پیدائش کے وقت ہی سے پائی جاتی ہو۔ فرعون، نمرود، معاویہ، یزید، ہٹلر، ریگن اور صدام جیسے ڈکٹیٹر دنیا میں آئے ہیں اور جنھوں نے مطلق العنان بن کر عوام پر ظلم ڈھائے ہیں۔ یہ سب پیدائشی طور پر آمر نہیں تھے۔ بلکہ یہ صفت ان میں بعد میں پیدا ہوئی۔

ذیل میں ہم ان عوامل کا ذکر کرتے ہیں جو لوگوں میں آمریت کی صفت پیدا ہونے کا سبب بنتے ہیں:

① —— حُبِّ دُنیا

② —— تکبّر

③ —— عجب (خود پسندی)

④ —— حسد

⑤ —— حُبِّ اقتدار اور حُبِّ ریاست

⑥ —— مبدا اور معاد سے انکار

⑦ —— نااہل افراد کا مناصب پر قبضہ

ان بُرائیوں میں سے ہر ایک بُرائی کے سلسلے میں چند احادیث ملاحظہ فرمائیں:

حُبِّ دُنیا

○ —— حضرت امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ:

"دنیا سے محبّت تمام غلطیوں کی بنیاد ہے"

○ —— حضرت امیر علیہ السلام فرماتے ہیں کہ :
" انسان کی سب سے بڑی خطا دُنیا سے محبت ہے "

○ —— حضرت امام صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ
" دنیا سے محبت انسان کو اندھا اور بہرہ بنادیتی ہے یہاں تک
کہ وہ حقیقت کو نہیں جان سکتا "

○ —— حضرت امیر علیہ السلام سے روایت ہے کہ :
" دنیا سے محبت عقل کو فاسد کرتی ہے ، دل کو حکمت سننے
سے بہرہ کرتی ہے اور دردناک عقاب کا موجب بناتی ہے "

○ —— حضرت امیر علیہ السلام فرماتے ہیں کہ
" تمام مصیبتوں کی جڑ دُنیا سے عشق ہے "

○ —— حضرت امیر علیہ السلام فرماتے ہیں کہ :
" حُبِّ دنیا ، فسادِ عقل کا موجب ہے "
اور فرمایا کہ :
" جس طرح سورج اور رات ایک جگہ جمع نہیں ہوسکتے اسی طرح
حُبِّ خدا اور حُبِّ دنیا ایک جگہ جمع نہیں ہوسکتے "

(قصار الجمل - جلد اوّل صفحہ ۱۳۲)

تکبُّر

○ —— امام صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ :
" کفر کی تین جڑیں ہیں :
۱ : لالچ ۲ : استکبار اور ۳ : حسد "

○ —— امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ سب سے ادنیٰ الحاد کیا ہے ؟ تو آپؑ نے جواب دیا کہ :

"سب سے ادنیٰ کفر تکبّر ہے۔"

○ —— امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا کہ :

"عزّت خدا کی ردا ہے ۔ تکبّر خدا کی قمیض ہے۔ جو بھی اس کو پہننا چاہے گا خدا اسے منہ کے بل جہنّم میں ڈالے گا۔"

○ —— امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ :

"کبر خدا کی ردا ہے ، متکبّر خدا کی ردا کو چھیننے کے لیے جنگ کرتے ہیں۔"

○ —— امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ :

"قیامت میں خداوندِ عالم متکبرین کو چیونٹیوں کی شکل میں محشور فرمائے گا اور اہلِ محشر انھیں اپنے پاؤں تلے روندیں گے یہاں تک کہ وہ حساب سے فارغ ہو جائیں۔"

○ —— حضرت امیر علیہ السلام سے روایت ہے کہ :

"تکبّر سے بچو کہ وہ تمام گناہوں سے بڑا گناہ ہے "

نیز فرمایا کہ :

"تکبّر تمام عیوب کی ماں ہے اور ابلیس کا حُلّہ ہے۔"

○ —— امام محمد باقر علیہ السلام سے پائخانہ سے متعلق سوال کیا گیا تو آپؑ نے فرمایا کہ :

"خداوند عالم نے اس کو انسان میں اس لیے پیدا کیا تاکہ وہ تکبّر نہ کرے کیوں کہ وہ اپنے (پیٹ کے) اندر پائخانہ

(جیسی نجس شے) رکھتا ہے۔"

○ —— حضرت امیر علیہ السلام نے فرمایا کہ:

"تعجب ہے بنی آدم پر کہ اس کی ابتدا نطفہ ہے اور اس کا آخر مُردار ہے۔ وہ ان دو نجس العین کے درمیان قائم ہے وہ پائخانہ جیسی گندی چیز کا ظرف ہے اور اس کے باوجود وہ تکبّر کرتا ہے۔"

(قصار الجمل۔ جلد اوّل۔ صفحہ ۱۷۵)

نوٹ:۔ اکثر احادیث وسائل الشیعہ سے نقل ہیں۔

عُجُب۔ (خودپسندی)

○ —— پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم سے مروی ہے کہ:

"تین چیزیں انسان کو ہلاکت کی طرف لے جاتی ہیں:

○ —— بُخل وکنجوسی

○ —— خواہشاتِ نفس کی پیروی

○ —— خودپسندی۔"

○ —— حضرت امیر علیہ السلام نے فرمایا کہ:

"خودپسندی انسان کی عقل کی کمزوری کی علامت ہے۔"

○ —— امام صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ:

"خدا جانتا ہے مومن کے لیے خودپسندی سے گناہ بہتر ہے۔ اگر خودپسندی نہ ہوتی تو کوئی بھی مومن گناہ نہ کرتا۔"

○ —— حضرت امیر علیہ السلام فرماتے ہیں کہ:

"وہ گناہ جسے کرنے کے بعد تم بُرا سمجھتے ہو، خدا کے نزدیک تمھاری اس نیکی سے کہیں اچھا ہے جس پر تم ناز کرو۔"

○ —— امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں کہ:

"تین چیزیں انسان کی کمر توڑ دیتی ہیں:۔

○ —— اپنے عمل کو زیادہ سمجھنا۔

○ —— اپنے گناہ کو فراموش کر دینا۔

○ —— اپنی رائے پر خوش ہونا۔

(قصار الجمل جلد دوم۔ صفحہ۱۶)

حسد

○ —— حضرت امیر علیہ السلام سے مروی ہے کہ:

"حاسد ہمیشہ بیمار رہے اگرچہ اس کا جسم صحیح نظر آئے"۔

○ —— حضرت امیر علیہ السلام سے مروی ہے کہ:

"حسد کا ثمر دنیا اور آخرت کی شقاوت ہے۔"

○ —— امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں کہ:

"حسد، جھوٹ اور دشمنی کو چھوڑ دو۔ یہ تین چیزیں دین کو پسند نہیں۔ یہ انسان کو ہلاکت کی طرف لے جاتی ہیں۔"

○ —— امیر المومنین علیہ السلام سے روایت ہے کہ:

"حاسد تم سے کبھی راضی نہیں ہوگا۔ یہاں تک کہ تم دونوں میں سے ایک مر نہ جائے۔

○ —— امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ:

" حسد ایمان کو کھاتا ہے جس طرح کہ آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے "

○ —— پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ :

" فقر کفر سے نزدیک ہے اور حسد تقدیر پر غالب ہے "

(فصار الجمل۔ جلد اوّل صفحہ ۱۴۸)

حُبِّ اقتدار اور حُبِّ ریاست

حُبِّ اقتدار اور حب ریاست ایسی بُری شے ہے کہ خداوند عالم نے قرآن کریم میں اس کو زمین میں فساد پھیلانے والوں کے ساتھ یا اس کے ردیف میں قرار دیا ہے۔ اور زمین میں فساد پھیلانے والوں کی قرآن میں دردناک سزائیں مقرر کی ہیں جن میں سے ایک سزائے موت ہے۔ اور آخرت میں دردناک عذاب ہے۔

جتنی یہ صفت انسان میں بڑھتی جاتی ہے اتنا ہی صفتِ آمریت کا اس میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ مسندِ رسولؐ پر قابض جابر و ظالم نام نہاد خلیفۂ عباسی ہارون الرشید یہ کہتا ہوا نظر آتا ہے :

اگر رسول اللہؐ بھی میری حکومت کے خلاف
مزاحمت کریں گے یا مطالبہ کریں گے تو میں
ان کے سر کو تن سے جدا کردوں گا " عیاذ باللہ

(کتاب موسیٰ ابن جعفرؑ۔ تالیف باقر قرشی)

مبدا اور معاد سے انکار

اگر کوئی شخص خدائے بزرگ و برتر کو حاضر و ناظر نہ سمجھتا ہو

اور یہ عقیدہ نہ رکھتا ہو کہ خداوندِ عالم اس کے اعمال و افعال کو دیکھ رہا ہے اور روزِ جزا پر ایمان نہ رکھتا ہو تو ایسے افراد کی زندگی کسی اصول و ضابطہ کے تحت نہیں ہوتی اور جب وہ اپنے آپ کو ہر قید و بند اور اصول و ضابطہ سے آزاد سمجھتے ہیں تو پھر وہ انسانی صفت سے ہٹ کر خواہشاتِ حیوانی کے تابع ہو جاتے ہیں اور اپنی نفسانی خواہشات کی پیروی کرنے لگتے ہیں۔

اور جیسا کہ خدا فرماتا ہے

" نفس، انسان کو برائیوں کی طرف زیادہ دعوت دیتا ہے۔"

نفسانی خواہشات کی پیروی سے بڑھ کر انسان اور انسانیت کے لیے کوئی خطرہ نہیں۔ چنانچہ امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

" میں تمھارے متعلق دو چیزوں کے بارے میں زیادہ خوف رکھتا ہوں۔ ایک تو خواہشات کی پیروی، دوسرے طویل اور لمبی غلط امیدیں، کیونکہ اتباعِ ہوا، انسان کو حق سے دور رکھتی ہے اور لمبی لمبی امیدیں انسان کو توبہ سے باز رکھتی ہیں۔"

نااہل افراد کا مناصب پر قبضہ

عقلِ سلیم اور شریعتِ اسلامی کی رُو سے کسی منصب و مقام پر فائز فرد کے لیے اس منصب سے متعلق معین معیار و شرائط کا حامل ہونا ایک بدیہی امر ہے۔

اور جب بھی منصب عطا کرتے وقت ان معیار وصفات سے صرفِ نظر کیا گیا اور معین شرائط وحدود سے روگردانی کی گئی اس کے خطرناک نتائج ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہے۔

اس سلسلہ میں تنبیہ اور تہدید پر مبنی چند احادیث و روایاتِ معصومینؑ ملاحظہ فرمائیں:

پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے:

"جو شخص بھی مسلمانوں کے اوپر حکومت کرنے کے لیے خود کو پیش کرے جبکہ وہ جانتا ہو کہ اس سے بہتر اور افضل افراد موجود ہیں تو گویا اس نے خدا اور اس کے رسولؐ سے خیانت کی۔"

(الحیات جلد دوم صفحہ ۳۶۲ - الغدیر جلد ہشتم صفحہ ۲۹۱)

ایک اور مقام پر پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منحرف مذاہب اور ان کے علماء و فقہا کی مذمت کرتے ہوئے اپنے صحابی ابن مسعود سے فرمایا:

"ان کے علماء اور فقہا خائن اور فاجر ہیں۔ بالتحقیق یہ لوگ اشرارِ خلق اللہ ہیں۔ اسی طرح ان کی پیروی کرنے والے جو بھی ان کے پاس آئیں اور ان سے دین و دنیا کے مسائل لیں، ان سے محبت کریں، ان سے مجالست کریں اور ان سے مشورہ کریں سب شرِ خلق اللہ ہیں"

ان دو احادیث میں پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسے افراد کی مذمت فرمائی ہے جو بغیر کسی اہلیت اور صلاحیت کے خود کو کسی قوم و ملت پر مسلط کریں۔

اور فرمایا کہ ان کا یہ عمل ایسا ہے گویا انھوں نے خدا، رسولؐ اور اس قوم سے خیانت کی، خدا انھیں خیانت کرنے والوں کے ساتھ محشور فرمائے گا جبکہ دوسری حدیث میں آنحضرتؐ نے ایسے افراد اور ان کی پیروی کرنے والوں کو بدترین خلق اللہ بتایا ہے۔

○ —— پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ:

"اگر کوئی شخص کسی قوم کی امامت اور رہبری کرے جبکہ اس سے زیادہ عالم اور فقیہ موجود ہو تو ان کے امور ہمیشہ تا قیام قیامت روبہ زوال ہوتے رہیں گے۔"

اس حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تنہا آمر اور غیر صالح افراد کی مذمت نہیں کی بلکہ اس قوم کو بھی اس خطرے سے آگاہ کیا اور متنبہ کیا ہے کہ اگر ایسے افراد کو قبل از وقت نہ ہٹایا جائے تو یہ پوری امت کے لیے عظیم خطرے کا باعث ہوگا۔

○ —— امام حسین علیہ السلام نے فرمایا کہ:

"میں نے اپنے جدّ بزرگوار سے سُنا ہے کہ "جب بھی معاویہ میرے منبر پر نظر آئے تو اس کے شکم کو چاک کرنا"۔ یقیناً اہلِ مدینہ نے اس کو منبرِ رسولؐ پر دیکھا لیکن انھوں نے پیغمبر اکرمؐ کی حدیث پر عمل نہیں کیا۔ لہٰذا خدا نے ان پر یزید جیسے فاسق و فاجر شخص کو مسلط کرکے ان کو مبتلا کیا۔"

(میزان الحکمۃ)

اس حدیث سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اگر حکومت اور ریاست سے کسی نااہل شخص کو نہ ہٹایا جائے تو خداوند عالم اس سے بدتر فاسق و فاجر شخص کو قوم پر

مسلّط کر دیتا ہے۔ جیسا کہ طولِ تاریخ میں ایسی کئی مثالیں ہمیں نظر آتی ہیں اور اس سلسلہ کی واضح ترین مثال وہ ہے کہ جب تقریباً ۲۰ سال تک مسلمانوں نے معاویہ بن ابی سفیان کی حکومت کے خلاف قیام نہیں کیا اور ہر قسم کی ظلم وزیادتی اور دین سے انحراف کو اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود اس سلسلہ میں کوئی اقدام نہیں کیا تو اس خاموشی اور بے عملی کے نتیجے میں یزید ابن معاویہ جیسا فاسق وفاجر حکمران ان پر مسلّط ہوا۔

کیونکہ لوگوں نے اولین مرحلے ہی میں اس انحراف کا تدارک نہیں کیا اور اس ظلم وستم کے سامنے خاموش تماشائی بنے رہے۔ اس لیے یہ ظلم وفساد اتنا پھیل گیا اور انحراف نے اتنی گہری جڑیں پکڑ لیں کہ اس کا ازالہ کسی بہت بڑی اور عظیم ہستی کی قربانی ہی کے ذریعے کیا جاسکتا تھا۔

○ —— پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

"ریاست اور حکومت کا کوئی سزاوار نہیں لیکن خدا اور وہ ذوات کہ جو اس کی اہل ہوں۔ جو شخص بھی اپنے آپ کو ایسی جگہ رکھے گا جس کا وہ اہل نہ ہو تو خدا اس کو نابود کر دے گا۔ اگر کوئی شخص لوگوں کو اپنی طرف دعوت دے اور یہ دعویٰ کرے کہ میں تمھارا رئیس ہوں جبکہ وہ اس کا اہل نہ ہو تو خداوند عالم اسے نظر رحمت سے نہیں دیکھے گا جب تک وہ اپنے دعوئ سے توبہ نہ کرلے۔"

(الحیات۔ جلد دوم۔ صفحہ ۳۶۳
تحف العقول۔ صفحہ ۳۶)

کسی بھی امت، قوم وملت یا تنظیموں کے لیے اس سے زیادہ خطرہ نہیں ہو سکتا کہ اس کی تقدیر اور اس کی باگ ڈور ایسے افراد کے ہاتھوں میں آجائے جو اس کے اہل نہ ہوں۔ اس حدیث سے یہ بات واضح اور روشن ہے کہ اگر کوئی شخص جو نااہل ہو

خود کو کسی منصب اور ریاست کے لیے پیش کرے یا کسی ایسے ہی نا اہل فرد کے لیے کوشش کرے تو یہ خدا، اس کے رسولؐ اور اس ملت کے ساتھ ایک بہت بڑی خیانت ہے اور امت کو فساد اور زوال کی طرف لے جانے کے مترادف ہے۔

منقول ہے کہ ایک دن معاویہ ابن ابوسفیان نے اپنی خصوصی نشست میں شرکار محفل سے کہا کہ وہ امت کے درمیان ہونے والے فتنہ و فساد کے ذمہ دار افراد کی نشاندہی کریں۔

حاضرین نے خوشامد کے طور پر کہا کہ:

"امت میں فتنہ و فساد کی تمام ذمہ داری علیؑ پر عائد ہوتی ہے کیونکہ علیؑ نے آپ کی خلافت کی مزاحمت کی۔" (العیاذ باللہ)

اسی طرح ہر شخص نے اپنے اپنے انداز فکر کے مطابق کسی نہ کسی کو فتنہ و فساد کا ذمہ دار ٹھہرانے کی کوشش کی۔ لیکن معاویہ ابن ابوسفیان نے ان سب کے جوابات کو مسترد کرنے کے بعد کہا کہ:

"امت میں فتنہ و فساد کی تمام ذمہ داری حضرت عمر پر عائد ہوتی ہے۔ حضرت عمر نے شورائی خلافت میں نا اہل افراد کو شامل کر کے بہت سے ایسے افراد کے دلوں میں حکومت کی طمع اور لالچ کا بیج بو دیا جن کے دلوں میں حکومت و خلافت کا کبھی خواب و خیال بھی نہ آیا تھا۔ خلیفہ دوم کے اس اقدام کا یہ نتیجہ ہوا کہ بہت سے لوگ یہ سوچنے لگے کہ جب ایسے افراد خلیفۃ المسلمین بن سکتے ہیں تو پھر

ہم کیوں نہیں بن سکتے ۔"

موعظہ و عبرت

وہ ذواتِ مقدسہ جو آیاتِ قرآنی اور رسول اکرمؐ کی متواتر نصوص کے تحت حکومت اور اقتدار کی حق دار تھیں، خلافت وحکومت کی جستجو کے موقع پر خدا سے یہ مناجات کرتی ہوئی نظر آتی ہیں کہ :

" ہم اس مقام خلافت وحکومت کے لیے جو
کچھ کر رہے ہیں وہ دنیوی اقتدار اور مال ومنال
دنیا کو جمع اور ذخیرہ کرنے کے لیے نہیں کر رہے
تو ہمارے ضمیر سے بہتر واقف و باخبر ہے ۔"

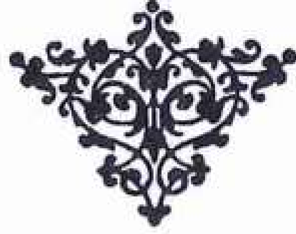
امام حسین علیہ السلام اپنی دعوت پر مکہ میں جمع ہونے والے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے اپنے خطبہ کے آخر میں یوں ارشاد فرماتے ہیں :

" خداوندا تو بہتر جانتا ہے کہ خلافت کو اس کے مرکزِ
اصلی کی طرف واپسی کے لیے جو کچھ ہمارے دلوں میں
خواہش و آرزو ہے اور اس کیلیے ہماری کوشش و
سعی ہے وہ دنیا کے ذلیل وحقیر مال ومنال کی
خواہش میں نہیں بلکہ ہم تیرے دین کے محکم
اصولوں کو قائم ہوتے ہوئے دیکھنا چاہتے ہیں
تیری اس مملکت میں اصلاح کے خواہاں ہیں
اور تیرے مظلوم بندوں کے لیے امن و امان کے
خواہاں ہیں ۔ ہم تیرے واجب وسنت پر عمل

ہونے کی خواہش کرتے ہیں۔" (تحف العقول صفحہ ۱۷۲)

اسی مضمون کے کلمات حضرت علی علیہ السلام نے بھی اپنے دورِ خلافت میں اپنی حکومت کی مزاحمت کرنے والوں کے ساتھ جنگ کے دوران ارشاد فرمائے۔

ان تمام احادیث اور روایات سے یہ بات اچھی طرح واضح ہوجاتی ہے کہ آمریت اور ڈکیٹیٹر شپ وراثت میں ملنے والی کوئی چیز نہیں بلکہ یہ انسان میں کچھ عوامل اور اسباب کے تحت وجود میں آتی ہے۔ چنانچہ اگر ہم معاشرے میں رائج اور موجود آمریت اور طاغوت کی مزاحمت کرنے کے خواہاں ہیں تو ہمیں طاغوت و آمریت کے ان اسباب و عوامل کو اپنے اور اپنے معاشرے کے درمیان سے جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی کوشش کرنا چاہیے۔



آمریت کے قبیح نتائج و آثار

اس باب میں جیسے کہ اس کے عنوان سے ظاہر ہے ہم اُن قبیح نتائج و آثار پر روشنی ڈالیں گے جو آمریت کے دوام و قیام کے نتیجے میں ظاہر ہوتے ہیں۔

(۱) اصولوں کی پائمالی

آمریت کیونکہ خود بے اصولی کے نتیجہ میں وجود میں آتی ہے اسی بنا پر آمرانہ دور میں حقائق، ضابطے، معیار سب یکسر ختم ہوجاتے ہیں اور فقط حاکم کی خواہشات یا اس کی حکومت کے دوام اور بقا کی منصوبہ بندی ہی ایک معیار و میزان باقی رہ جاتی ہے۔

تاریخ ہمیں ایسے بے شمار آمروں سے متعارف کرواتی ہے جنھوں نے اپنی آمرانہ حکومتوں کے دوام کی خاطر بے اصولی اور لاتانونیت کو فروغ دیا۔

ایسے ہی لوگوں میں عبدالملک بن مروان کا شمار ہوتا ہے جس نے اپنی حکومت

کوطول دینے اور اپنی مخالفت میں اٹھنے والی تحریکوں کی سرکوبی اور مظلوم و محکوم عوام کو خوف و ہراس میں مبتلا رکھنے کی خاطر، حجاج بن یوسف جیسے خونخوار اور ظالم و جابر شخص کو امت پر مسلط کیا۔ وہ حجاج بن یوسف کہ جس کے بارے میں عمر بن عبد العزیزؒ کا قول ہے کہ:

" اگر کوئی قوم اپنے خبیث ترین اور فاجر ترین فرد کو لائے اور ہم بنی امیہ اس کے مقابلہ میں "حجاج" کو پیش کریں تو ہمارا پلّہ بھاری رہے گا۔"

حسن بصری سے عبد الملک بن مروان کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے جواب دیا کہ:

" میں اس شخص کے بارے میں کیا کہوں کہ جس کے کبیرہ گناہوں میں سے ایک بڑا گناہ حجاج بن یوسف کو والی بنانا تھا۔"

تاریخِ عالم ایسے حکمرانوں کے واقعات سے بھری پڑی ہے جنھوں نے اپنے چند روزہ اقتدار کی بقا اور دوام کے لیے نہایت پاکیزہ اصولوں کو پامال اور ارفع معیارات کو پس پشت ڈالا ہے۔ تاریخِ اسلام میں خصوصاً بنی امیہ اور بنی عباس کا دور ایسی مثالوں سے بھرا پڑا ہے۔

② سرمایہ کا چند ہاتھوں میں محدود ہو جانا

اپنے غیر قانونی اقدامات کے تحفظ اور حمایت کے لیے امت پر مسلط حکمرانوں کو ہمہ وقت ایسے بے ضمیر انسانوں کی ایک تعداد درکار ہوتی ہے جو ان کے ان غیر انسانی، غیر اخلاقی اور لادینیت و بے اصولی پر مبنی اقدامات کو تحفظ

فراہم کریں اور انھیں حق بجانب قرار دینے کے لیے اپنی زبان و قلم کو کام میں لائیں، اور تہدید و تعذیب سے بھی گریز نہ کریں۔

چنانچہ حکمرانوں کی خاص نوازشیں ایسے بے ضمیر انسانوں کے شامل حال ہوتی ہیں اور بیت المال کے دروازے بھی ایسے ہی لوگوں پر کھول دیے جاتے ہیں جس کے نتیجے میں سرمایہ ایک خاص طبقہ میں محدود ہو جاتا ہے۔

ایسے ہی حالات و نتائج کی جانب اشارہ کرتے ہوئے حضرت علیؑ ارشاد فرماتے ہیں کہ:

"میں ڈرتا ہوں کہ اس امت پر جاہل و فاسق و
فاجر افراد مسلط ہو جائیں اور مالِ خدا چند
افراد میں محدود ہو جائے۔"

(ثورۃ الحسینؑ۔ مہدی شمس الدین صفحہ ۵۵
نقل از نہج البلاغہ)

حضرت علیؑ نے مسندِ اقتدار پر آنے کے بعد جو اقدامات کیے ان میں سے ایک اہم قدم دولت کو ایسے لوگوں کے قبضہ سے حاصل کرنا بھی تھا۔

آپؑ نے فرمایا:

"خدا کی قسم اگر مجھے ایسا مال بھی کہیں نظر آیا جو
عورتوں کو مہر اور کنیزوں کی خریداری پر صرف
کیا جا چکا ہے تو اسے بھی واپس پلٹا لوں گا۔"

(نہج البلاغہ۔ خطبہ ۱۴)

حضرت عثمان کے دورِ اقتدار میں امویوں کی دولت مندی پر تاریخ کے اوراق گواہ ہیں کہ:

"زبیر کی ملکیت ۵۰ ہزار دینار اور ایک ہزار گھوڑے، ایک ہزار غلام اور باغات بصرہ، کوفہ، مصر اور اسکندریہ میں تھے۔"

(مروج الذہب مسعودی)

"عبدالرحمن بن عوف کے اصطبل میں سو گھوڑے، ہزار اونٹ اور دس ہزار گوسفند تھے اور مرنے کے بعد اس کی مالیت کا چوتھائی حصہ ۸۴ ہزار درہم بنا۔"

(ثورۃ الحسین ص ۳۷۔ تالیف مہدی شمس الدین)

مروان بن حکم کہ جس کو رسول اللہ نے ملک بدر کیا تھا۔ حضرت عثمان نے اس کو واپس بلایا اور ایک مرحلہ پر تین لاکھ درہم اس کو دیے اور ایک موقع پر ۵ لاکھ درہم دیے۔ مروان کے بھائی حارث بن حکم کو ۳ لاکھ درہم دیے، ابوسفیان کو دو لاکھ درہم اور طلحہ کو دو لاکھ درہم دیے۔

(۳) اُمت کو اختلاف و افتراق میں مبتلا رکھنا

آمریت کا ایک منحوس نتیجہ امت میں اختلاف اور افتراق ہے۔ چونکہ طاغوتی نظام کو چلانے والے حکمران عوام کی رضا و رغبت کے بغیر ان پر مسلط ہوتے ہیں اور ہر وہ حکومت جس کی جڑیں عوام کی صفوں میں نہ ہوں وہ ناپائدار ہوتی ہے اور متزلزل رہتی ہے۔

ڈکٹیٹر حکمران اگرچہ اپنی حکومت کو عوامی حکومت ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن حقیقتاً وہ ہمیشہ عوامی طاقت سے ڈرے رہتے ہیں۔ کیونکہ باشعور اور

متحد عوام اپنے مخالف حکمرانوں کے لیے ہمیشہ ایک خطرے اور چیلنج کی حیثیت رکھتے ہیں لہٰذا ڈکٹیٹر حکمرانوں کو اپنے اقتدار کو سنبھالنے کے بعد سب سے پہلے اپنے اس خطرے اور چیلنج کو رفع کرنے کی فکر لاحق ہوتی ہے۔

اس خطرے اور چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے ان کے پاس سب سے زیادہ موثر، فعال اور کامیاب ہتھیار امت میں اختلاف پھیلانا ہے۔ چنانچہ وہ نئے مذہب ایجاد کرتے ہیں، حکومت کے مفاد میں نئی جماعتیں تشکیل دیتے ہیں اور ان کو تقویت دیتے ہیں جبکہ اپنے مخالفین کو کمزور کرنے کے لیے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے۔

چنانچہ خداوند تعالٰے قرآن مجید میں فرماتا ہے کہ:

" اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِی الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَائِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ اَبْنَاۗءَهُمْ وَيَسْتَحْيٖ نِسَاۗءَهُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ "

" بے شک فرعون اس سرزمین پر غالب تھا اور اس کے باشندوں کو اس نے کئی گروہ بنا دیا تھا کہ ان میں سے ایک کو کمزور رکھتا تھا ان کے بیٹوں کو ذبح کیا کرتا تھا اور ان کی بیٹیوں کو زندہ رکھتا تھا بے شک وہ فساد کرنے والوں میں سے تھا۔"

(سورۂ قصص ۔ آیت ۴)

اس اختلاف اور افتراق کے طریق کار کو قرآن نے کبھی لفظِ "تضعیف" اور کبھی لفظِ "استکبار" سے تعبیر فرمایا ہے۔

آمروں کے یہ ہتھکنڈے اور یہ مذموم وسائل و ذرائع کوئی نئی بات نہیں۔ بلکہ دورِ قدیم سے لے کر حالِ حاضر تک اپنی حکومت کی بقا اور دوام کے لیے ان کا یہی وطیرہ رہا ہے۔

معاویہ ابن ابوسفیان نے اپنے دورِ آمریت میں اسی وسیلہ سے اپنا اقتدار جمائے رکھا۔ اس نے اپنے مذموم عزائم کو پورا کرنے کے لیے کبھی قبائل میں اور کبھی عرب اور غیر عرب میں موجود اختلافات کو ابھارنے اور بھڑکانے کی کوشش کی۔

کبھی مذہب مرجیہ ایجاد کیا کہ جس کے ماننے والے ایمان کو دل کی حد و ذنک موجود رکھنے کو ضروری سمجھتے تھے اور عمل کی ضرورت کو مسترد کرتے تھے۔

ان کے عقیدے کے مطابق دل میں ایمان رکھ کر اگر تمام معصیتوں کو اپنالیں حتیٰ کہ اگر بت پرستی بھی کر لیں تب بھی کوئی حرج اور نقصان نہیں۔

امیر معاویہ اس مذہب کو پھیلانے کے لیے بیت المال مسلمین سے کثیر رقم خرچ کر کے کبھی اپنی برائیوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتا تھا اور کبھی مذہب جبریہ کو تقویت اور تائید دے کر اپنے آپ کو غلط اعمال کی انجام دہی سے سبکدوش کر کے ان کی ذمہ داری خدا پر ڈالنے کی کوشش کرتا تھا۔

آمریت کے ان مذموم عزائم سے دینِ اسلام کو جو خطرہ درپیش تھا اس کو دفع کرنے کے لیے ہمارے ائمۂ اطہارؑ اگر ایثار و قربانی نہ فرماتے تو یہ وسیع و عریض مملکتِ اسلامی کہ جس کی سرحدیں ہزاروں شہیدوں کے خون سے قائم ہوئی تھیں کب کی استعمارِ روم یا استعمارِ فارس کی نذر ہو چکی ہوتیں۔

آج اسلام کا ہمارے پاس باقی رہ جانا ہمارے ائمۂ اطہارؑ کے ایثار و قربانی

ہی کامرہونِ منت ہے ۔

ائمۂ اطہار علیہم السلام کی اس راہ میں خدمات کی فہرست تو یہاں پیش کرنے سے ہم قاصر ہیں کیونکہ یہ کتاب ہذا کی گنجائش سے باہر ہے ۔ البتہ اس سلسلے میں ہم بطورِ نمونہ امام حسین علیہ السلام کا وہ خط جو آپؑ نے مکّہ سے اہلِ بصرہ کے نام ارسال فرمایا تھا پیش کرتے ہیں ۔

امام حسین علیہ السلام نے مکّہ مکرّمہ سے بصرہ کے رؤسا و موالیٔ اہلبیت مسمع بکری ، احنف بن قیس ، منذر ابن جارود ، مسعود ابن عمرو نہشلی وغیرہ کے نام جو خط لکھا اس کا مضمون یوں ہے :

" حمد و ستائش خدا کے بعد بہ تحقیق خدا نے اپنے بندوں میں سے محمدؐ کو مصطفیٰ کیا اور اپنی نبوّت سے نوازا تبلیغ رسالت کے لیے انتخاب کیا ، بندگان خدا کو نصیحت کی اور اپنی رسالت کو پہنچایا ۔ اس کے بعد جب انھیں اپنی طرف بلایا تو اس وقت ہم ان کے اہل و ولی اور وارث تھے ۔ لوگوں کے درمیان سب سے زیادہ اس مقام و منصب کے حقدار تھے ۔ اس منصب کو ہماری قوم نے ہم سے چھین لیا ۔ ہم اس پر راضی رہے کیونکہ ہم امت میں تفرقہ اور اختلاف کو پسند نہیں کرتے تھے اور امن و عافیت کو دوست رکھتے تھے ۔ درآنحالیکہ ہم جانتے تھے کہ اس حق کے بارے میں ان لوگوں نے خود کو ہمارے اوپر ترجیح دی ۔ اب میں اپنے قاصد کو اس خط کے ساتھ تمھاری طرف بھیج رہا ہوں ۔ میں

تمھیں کتابِ خدا اور سنّتِ نبیؐ کی طرف دعوت دیتا
ہوں۔ بہ تحقیق سنّت مُردہ ہو چکی ہے اور بدعت
زندہ ہو چکی ہے۔ اگر تم میری بات سنو گے تو میں تمھیں
سیدھی راہ کی طرف ہدایت کروں گا۔"

(مقتلِ حسین۔ عبدالرزاق مقرم صفحہ ۱۵۹ نقل از طبری
جلد ۶ صفحہ ۲۰۰)

(الہوف ابن طاؤس صفحہ ۲۱)

(مثیر الاحزان صفحہ ۱۲)

استعمار جدید میں بین الاقوامی آمریت اور طاغوت نے مسلمانوں کے اندر جو تفرقہ اور اختلافات پھیلائے ہیں وہ آپ سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ نیشنلزم جیسے منحوس بُت کے ذریعہ افریقہ کے مسلمانوں کو ایشیا کے مسلمانوں سے جدا رکھا۔ ایشیا میں عرب اور غیر عرب کا تفرقہ پیدا کیا اور اب عالمِ اسلام میں شیعہ اور سنی کا افتراق پھیلایا جا رہا ہے۔

وہی شیعہ اور سنّی جو ایک زمانے میں خلافتِ عثمانیہ کی قیادت میں متحد ہو کر اور ایک صف میں کھڑے ہو کر اس استعمار سے نبرد آزما تھے۔ آج وہ ایک دوسرے سے دست و گریباں ہیں۔

استعمار نے فقط شیعہ اور سنّی میں اختلاف پھیلانے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ خود اہل سنت میں بریلوی اور دیوبندی فرقے بنا کر آپس میں ایک کو دوسرے کی ضد میں کھڑا کیا ہوا ہے تاکہ کسی شیعہ حکومت کا قیام تو ایک طرف اہل سنّت کی بھی کوئی اسلامی حکومت قائم نہ ہو سکے۔

استعمار کے ان منحوس عزائم کے نتیجہ میں آج ایک ارب سے زیادہ مسلمانوں پر صیہونی ٹولہ مسلط ہے۔ خود ہمارے ملک میں بھی آج اسّی کے قریب اسلامی نظام یا جمہوریت کی دعویدار پارٹیاں اس ملت مسلمہ پر جمہوریت کے نام پر ظلم و استبداد اور

آمریت اور طاغوت کی محافظ بنی ہوتی ہیں۔

ان جماعتوں اور پارٹیوں کے بارے میں یہ غلط فہمی نہ رہے کہ اگر یہ ساری پارٹیاں متحد و متفق ہوتیں تو ملک میں جمہوریت دوام پاتی، امن و سکون اور معاشی خوشحالی کا دور دورہ ہوتا بلکہ یاد رکھیں کہ یہ پارٹیاں اپنی جگہ اس مقصد پہ متحد اور متفق ہیں کہ یہاں کبھی بھی اسلام نہ آنے دیں اور یہاں مشرق یا پھر مغرب کے مفادات کا تحفظ ہوتا رہے۔

اگر یہ پارٹیاں صحیح معنوں میں جمہوریت کی خواہاں ہوتیں تو ان پارٹیوں میں موجود چند افراد کے سوا سب کے سب افراد کہ جو مبدار اور معاد پر ایمان رکھنے والے ہیں اور اس قرآن کریم کو ایک ضابطۂ حیات سمجھتے ہیں کہ جس کا دعویٰ ہے کہ اس میں ہر خشک و تر کا حکم موجود ہے وہ کبھی چند سکوں کی خاطر اس مملکت کو مشرق و مغرب کے صیہون نواز استعمار کے ہاتھوں فروخت نہ کرتے۔

لہٰذا ملک کی حفاظت اور نظامِ اسلام کے لیے ہمارا ان سے کسی بھی قسم کی امیدیں وابستہ رکھنا غلطی سے خالی نہیں بلکہ ہمیں چاہیئے کہ سب متحد ہو کر ائمۂ اطہارؑ کی سیرتِ صالحہ پر عمل کرتے ہوئے صیہونی اور استعماری مفاد کی جڑوں کو اکھاڑ پھینکیں ——!

ہم تمام اسلام پسند اور اسلام پر ایمان رکھنے والوں کی خدمت میں حضرت امیر المومنینؑ کے خطبے سے ایک فقرہ پیش کرتے ہیں:

"دائیں اور بائیں گمراہی کی راہیں ہیں اور درمیانی راستہ ہی صراطِ مستقیم ہے۔ اس راستے پر اللہ کی ہمیشہ رہنے والی کتاب اور نبوت کے آثار ہیں۔ اسی سے شریعت کا نفاذ و اجرار ہوا اور اسی کی طرف آخر کار

بازگشت ہے۔"

(نہج البلاغہ۔ خطبہ ۱۶)

ہمیں چاہیے کہ ہم دائیں اور بائیں بازو سے بچ کر رہیں تاکہ صراط مستقیم پر باقی رہیں۔

(۴) آمریت میں آزادی کا استحصال

آزادی ایک ایسی بزرگ و برتر نعمت ہے کہ جسے خداوند متعال نے انسان کو اس کی خلقت کے ساتھ ہی عطا فرمایا ہے۔ اس نعمت کے سامنے تمام نعمتیں ہیچ و کمتر ہیں۔

کسی انسان سے اس کی آزادی کو چھین لینا ایسا ہے جیسے اس سے انسانیت کو سلب کر کے اس کو حیوانوں کی صف میں دھکیل دیا گیا ہو۔

کسی انسان سے اس کی آزادی کو چھین لینے والا انسانیت کا بدترین دشمن ہے۔ انسانیت کے یہ بدترین دشمن ہمیشہ انسان کے عزم و ارادہ اور ثبات و استقامت کو متزلزل کرنے کے درپے رہتے ہیں اور ہمیشہ اس فکر میں رہتے ہیں کہ لالچ، طمع، شہوت پرستی اور نفس پرستی کے منحوس جال میں لوگوں کو پھنسا دیں۔

یہی وجہ ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے شہوت پرستی کے ان تمام راستوں کو کہ جہاں سے شیطان نفوذ کرتا ہے "ابواب جہنم" سے تعبیر کیا ہے اور اس کے برعکس نفس پر کہ جو انسان کا داخلی دشمن ہے غالب آجانے کو "جہاد اکبر" سے تعبیر فرمایا ہے۔

اسی طرح قرآن کریم، انسان کے اس خارجی دشمن کو کہ جو انسانی آزادی کا استحصال کرتا ہے، "طاغوت" سے تعبیر کرتا ہے۔

تمام انبیائے کرام جو خداوند کریم کی طرف سے مبعوث ہوئے وہ اسی

محبوس ومقید اور آزادی وحریت سے محروم معذب انسان کے لیے ان دشمنانِ انسان اور دشمنانِ حریت سے اجتناب و پرہیز اور خدائے وحدہٗ لاشریک کی پرستش کرنے کی دعوت لے کر آئے۔

جیسا کہ خداوندِ عالم فلسفۂ بعثت میں فرماتا ہے :

" ہم نے ہر امّت میں جب رسول بھیجا تو یہ دعوت دے کر بھیجا کہ خدا کی عبادت کرو اور طاغوت سے نفرت کرو۔"

لیکن نہایت افسوس کے ساتھ ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ مشرق ومغرب کے نام نہاد علم بردارانِ حقوق انسانیت نے انسان کے روپ میں جو انسانیت سوز کارنامے انجام دیے اور اس مقدس رمزِ انسانیت کو جس طرح پامال کیا وہ دورِ قدیم کے بدترین دورِ غلامی سے کسی طرح کم نہیں۔

مشرق ومغرب کے نظاموں نے جس طرح آزادیٔ انسان کو پامال کیا اس کے ذکر سے قبل ہم چاہیں گے کہ آزادی کی تعریف ذہن نشین ہو جائے۔

آزادی کی تعریف

ہر قسم کی ناگوار پابندیوں سے چھٹکارا حاصل کر لینے کو آزادی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ موضوع سے کماحقہٗ آگاہی کے لیے ہم ذیل میں آزادی کی چیدہ چیدہ اقسام کو بیان کریں گے۔

① ملکیت سے آزادی

بالکل اسی طرح کہ جیسے زمین، جائداد، سواری وغیرہ لوگوں کی ملکیت ہوتے ہیں

اسی طرح بعض انسان بھی دوسرے انسانوں کی ملکیت ہوتے ہیں۔ ایسے انسان کا اپنے ہم نوع انسان کی ملکیت سے چھٹکارا حاصل کر لینا آزادی کہلاتا ہے۔

۲ خواہشات سے آزادی

بعض انسان اپنی خواہشاتِ نفسانی کے اسیر ہوتے ہیں اور اپنی خواہشات کی مخالفت پر قادر نہیں ہوتے۔ ایسے لوگ اگر اپنی خواہشاتِ نفس پر قابو پالیں تو ان کا یہ خواہشاتِ نفس پر قابو پالینا اس سے ان کی آزادی کہلاتا ہے۔

۳ معاشرتی قیود سے آزادی

معاشرہ میں پائے جانے والے غلط رسوم و رواج بھی انسانوں کو اپنی قید میں لیے ہوتے ہیں اور لوگ ان غلط عادات و رسوم کی حقیقت سے واقفیت اور ان کے نقصان سے آشنا ہونے کے باوجود ان کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں سے معاشرہ میں کسی مثبت تبدیلی کی امید نہیں کی جاسکتی۔ اور ایسے لوگ جو غلط معاشرتی رسوم و رواج کی قید سے آزاد ہونے کی طاقت و صلاحیت کے حامل ہوں انھیں سے معاشرہ میں کسی مثبت تبدیلی کی امید کی جاسکتی ہے۔

۴ سیاسی آزادی

کسی قوم یا حکومت کے اجتماعی امور و مفادات میں کسی دوسری قوم یا حکومت کی ایسی مداخلت کہ جس کی بنا پر ان اجتماعی امور و مفادات میں فیصلہ کرنے میں یہ قوم یا حکومت آزاد و خود مختار نہ ہو سیاسی غلامی کہلاتی ہے۔

بدترین سیاسی غلامی وہ ہے جس میں مقابل فریق براہ راست مداخلت کرے

جیسے کرنسی ، فوج اور صاحب اقتدار طبقہ غالب گروہ سے تعلق رکھتا ہو۔

اور دوسرا طریقہ بالواسطہ غلام بنانا ہے۔ اس طریقہ کے مطابق فیصلہ پر عملدرآمد براہ راست نہیں بلکہ اپنے ایجنٹوں کے ذریعہ کرایا جاتا ہے۔ قوم بظاہر اپنے آپ کو آزاد تصور کرتی ہے لیکن حقیقتاً وہ دوسری اقوام کی غلام ہوتی ہے۔

قوموں کو اس قسم کی غلامی سے نجات دلانا براہ راست غلامی سے نجات دلانے کی بہ نسبت کہیں زیادہ مشکل ہے۔

مندرجہ بالا سطور میں ہم نے آزادی کی چیدہ چیدہ اقسام بیان کیں جن کی مدد سے یقیناً قارئین آزادی کے حقیقی مفہوم اور اس کی وسعت و ہمہ گیری سے آشنا ہوئے ہوں گے۔ اب ہم انسانی آزادی کے حوالہ سے دنیا بھر میں پائے جانے والے تین نظریات کا تذکرہ کریں گے۔

الف: مغرب کا تصوّرِ آزادی

○ مطلق العنان آزادی

مطلق العنان آزادی کہ جس میں انسان کو بغیر کسی قید اور روک ٹوک اور بغیر کسی مہار اور لگام کے آزاد چھوڑ دیا جائے۔ وہ جو چاہے کرے اس کی راہ میں کوئی چیز مانع اور رکاوٹ نہ ہو۔

اگر وہ طاقت و قدرت کے بل بوتے پر کسی ضعیف اور کمزور انسان کے حقوق کو پامال بھی کرے تو نہ تو اس کی ذات اور اس کے نفس میں موجود کوئی داخلی قوت (یعنی ایمان وضمیر) اور نہ کوئی بیرونی قانون ایسا ہو جو اس کی زیادتیوں کی روک تھام کرسکے۔ اسی نوع کی آزادی کو مغرب اور اس کے سرمایہ دارانہ نظام نے اپنا کر

انسانی زندگی کو حیوانی زندگی میں بدل کر رکھ دیا ہے۔ اور دنیا کو درندوں اور چرندوں کا ماحول بنا دیا ہے۔

اس قسم کی آزادی سے فقط طاقت و قدرت رکھنے والے لوگ اور سرمایہ دار ہی مستفیض اور بہرہ مند ہوتے ہیں۔

لیکن یہ بات ذہن نشین رہے کہ آج اس نوع کی آزادی کے نتیجہ میں مغرب کے رہنے والے جو عیش و عشرت کی زندگی گزار رہے ہیں اور خوش و خرم ہیں تو یہ سب کچھ ان کی اپنی آزادی و حریت کا نتیجہ نہیں ——

بلکہ انھوں نے یہ عیش و عشرت،

اس نظام کے مستعمرات میں رہنے والے ہزاروں انسانوں کو آزادی کی نعمت اور ان کو ان کے حقوق سے محروم کرکے اور ان کا خون چوس کر حاصل کیا ہے!

عیش و عشرت میں مگن مغرب کے یہ لوگ ——

کاش یہ محسوس کر سکتے کہ ان کے زیر تسلط دوسرے ملکوں میں رہنے والے کہ جن کی آزادی و حریت کی قیمت پر ان کے عشرت کدے آباد ہیں وہ کس کرب و عذاب میں مبتلا ہیں۔

آئیے! اس آزادی کے مختلف پہلوؤں کا ایک جائزہ لیں جو سرمایہ دارانہ نظام نے انسانیت کو تفویض کی ہے اور مغرب جس کا علمبردار و نقیب ہے۔

مغرب کے سرمایہ دار بلاک نے جو نظام آزادی انسانیت کے لیے پیش کیا ہے اس کا جائزہ لینے سے قبل چند نکات پر توجہ ضروری ہے۔

آزادی کی ایک قسم تو وہ ہے جو طبیعت اور فطرت کی طرف سے عطا کردہ ہوتی ہے۔ جو ہر شے کی طبیعت اور فطرت میں اس کی ہستی کی مناسبت سے ہوتی ہے۔

جیسے کہ نباتات میں جمادات کے مقابلے میں معمولی سی آزادی پائی جاتی ہے جبکہ حیوانات، نباتات کے مقابلے میں کہیں زیادہ آزادی کے مالک ہوتے ہیں۔

لیکن انسان اس کے برخلاف تمام مخلوقات کے مقابلے میں حد سے زیادہ بااختیار اور آزادی کا مالک ہے یہاں تک کہ یہ انسان اس آزادی سے غلط استفادہ کر کے اپنے خالق اور معبود ہی کا طاغی اور سرکش بن جاتا ہے۔

خداوند متعال نے اپنے انبیاء کے توسط سے اس طبعی آزادی کی حدود کا تعین فرمایا ہے۔ جو اس معینہ حد کے اندر رہے اسلام کی زبان میں اسے مومن کہا جاتا ہے۔

اور جو ان حدود سے تجاوز کر کے دوسروں کی آزادی کو سلب کرے یا دوسروں کی آزادی پر قابض ہو جائے اسے کافر اور طاغی کہا جاتا ہے۔

مخلوقات انسانی میں ایک کثیر تعداد قدرت کی عطا کردہ اس طبیعی آزادی کو اپنے رب اور اپنے معبود کے خلاف استعمال کرتی ہے۔

یہاں سے یہ بات واضح اور روشن ہے کہ آزادی جو فطرت کی طرف سے ودیعت ہوتی ہے وہ کسی نظام یا انسان کی عنایت کردہ نہیں ہوتی اور نہ ہی کوئی اس کا دعویٰ کر سکتا ہے کہ طبیعی آزادی اس کی عطا کردہ ہے۔

آزادی کی دوسری قسم وہ ہے جو ایک اجتماعی نظام یا حکومت اپنی رعایا کو دیتی ہے ——— !

نظامِ حکومت کی طرف سے عوام کو دی ہوئی یہ آزادی اگر فطرت سے ہم آہنگ اور شریعتِ الٰہی کے عین مطابق ہو ———،

اور واقعتاً انسان کو اس سرزمین میں کہیں نصیب ہو تو وہ سرزمینِ جنت نظیر ایک مقدس سرزمین ہوگی۔ اور اس میں بسنے والا معاشرہ صحیح معنوں میں

انسانی معاشرہ کہلائے گا۔

مرحوم شہید آیت اللہ سید باقر الصدر قدس سرہٗ اس آزادی کو "حریتِ جوہری" سے تعبیر کرتے ہیں۔

آزادی کے اس نظام میں حکومت جہاں اپنے عوام کو غذا ، لباس، رہائش کی آزادی دیتی ہے وہاں ان کے لیے وسائل رہائش و آسائش کا حصول بھی حکومت اپنے ذمہ قرار دیتی ہے۔

مثال کے طور پر ہر شخص کو ملک میں جہاں حصول تعلیم کی آزادی میسر ہے وہاں تعلیمی مواقع بھی بغیر کسی ناقابل برداشت اخراجات کے حکومت فراہم کرتی ہے اور ہر شخص بغیر کسی امتیازی سلوک کے پرائمری سے لے کر یونیورسٹی تک تعلیم حاصل کر سکتا ہے۔

ایسے نظامِ حکومت میں آزادی کے ساتھ ساتھ مکان اور کسبِ معاش کے ذرائع بھی حکومت فراہم کرتی ہے۔ اس کے مثالی نمونے جو اسلام نے پیش کیے ہیں ہم آگے چل کر انشاء اللہ بیان کریں گے۔

اس کے برخلاف ــــــــ

مملکت کی طرف سے عوام الناس کو دی ہوئی وہ آزادی جو صرف الفاظ اور قانون سازی کی حد تک محدود ہو وہ "شکلی" اور "صوری" ہوتی ہے۔

وہاں مسکن کے لحاظ سے ہر فرد بشر آزاد ہے ــــــ

کہ وہ ملک میں بہتر سے بہتر بنگلے اور کوٹھیاں بنائے چاہے ملک کی کثیر آبادی کو رہنے کے لیے جھونپڑی تک نصیب نہ ہو۔

یہاں ہر شخص کو آزادی ہے ــــــــ

کہ وہ بہتر سے بہتر مرغن غذائیں کھائے چاہے ملک کے لاکھوں

باشندے ایک وقت کی روٹی کو محتاج ہوں۔

جہاں ملک کے ہزاروں نوجوان تعلیمی میدان میں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں عدم گنجائش یا پھر کمر توڑ اخراجات کی وجہ سے پرائمری کلاسوں سے آگے نہ بڑھ سکتے ہوں۔

جیسا کہ ہمارے ملک میں ہے کہ

جہاں نام کو تو ہر شخص کے لیے پرائمری سے لے کر یونیورسٹی تک تعلیم کے دروازے کھلے ہوئے ہیں،

لیکن بدقسمتی سے اعلیٰ تعلیم فقط دولتمند اور صاحبِ ثروت افراد کی اولادیں ہی حاصل کر سکتی ہیں۔

یہاں لوگ لفظ آزادی کے صرف تصور سے تو لطف اندوز ہو سکتے ہیں، آزادی سے بہرہ مند نہیں۔

اس قسم کی آزادی ہی کو شہید آیت اللہ سید باقر الصدر قدس سرہٗ "حریتِ شکلی" اور "حریت صوری" سے تعبیر فرماتے ہیں۔

ہمارا یہ بیان کہیں مغرب کی آزادی کے فریفتہ افراد کو ناگوارِ خاطر نہ ہو اور وہ ان حقائق کو خلافِ واقعہ قرار دے کر یہ نہ کہیں کہ:

"اسی آزادی کے طفیل میں آج مغرب کے عوام، طعام، رہائش و آسائش اور وسائل نقل وحمل، ہر لحاظ سے بہرہ مند ہیں۔"

ان کی خدمت میں ان کی اطلاع کے لیے یہ گزارش ہے کہ مغرب کی آزادی کے دعویدار اگر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ آسائشیں پوری نوع انسانی کے لیے ہیں تو انھیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ انھوں نے یہ تمام راحت و آسائشیں غریبوں کے خون پسینے کی کمائی اور محروم اور مستضعف انسانوں کا خون چوس کر حاصل کی ہیں۔

کاش وہ احساس کرسکیں کہ انھوں نے یہ وسائل کروڑوں انسانوں کی غلامی اور بدبختی کی قیمت پر حاصل کیے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی ڈاکوؤں کا ٹولہ دوسروں کا مال لوٹ کر ہر قسم کی نعمت و آسائش سے مالامال ہو اور اس کی لوٹ مار کے نتیجہ میں پتہ نہیں کتنے انسان محروم و لاچار اور غریب الوطن اور غریب الدیار ہو گئے ہوں۔

مغرب زدہ اور مغرب پرست لوگ اس غلط فہمی میں نہ رہیں کہ مغرب والوں کو آج یہ راحت و آسائش صرف ان کی علمی اختراعات اور انکشافات کی مرہونِ منت ہیں —— نہیں، بلکہ ان کی راحتوں اور آسائشوں کا ایک عظیم حصہ، چند انسان نہیں بلکہ بہت سے ملکوں کی محرومیت اور بدبختی کی قیمت پر حاصل ہوا ہے اگر ایسا نہیں ہے اور ہمارے خطے سے ان کے کوئی مفادات وابستہ نہیں ہیں تو پھر وہ کیوں ہمارے ملکوں میں ہمارے خطے کے سیاسی ومعاشی معاملات میں مداخلت کرتے ہیں۔

اور جس دن اس خطے سے ان کے مفادات ختم ہوجائیں گے وہ دن ہمارے اچھے روزگار اور ہماری راحت و آسائش کا پہلا دن اور ہمارے لیے روزِ عید ہوگا۔ اور مغرب کے لیے پہلی بدبختی اور پہلی مصیبت کا دن ہوگا۔

نام نہاد آزادی کے دامِ فریب سے

مغرب کے اس طاغوت و آمریت نے بشریت کو جن مصائب آلام میں گرفتار کیا ہے وہ کسی ذی عقل، ذی شعور اور صاحبِ فکر ونظر سے پوشیدہ نہیں۔

کہیں یہ طاغوت اور اس کے ایجنٹ اسلام پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نفاذِ اسلام کے جھوٹے دعوؤں کا ڈھونگ رچاکر دھوکہ وفریب دیتے ہیں اور کہیں یہ آمر اور طاغوتی نمائندے کسی ملک کے نوخیز حقیقی انقلاب اسلامی

اور نشاۃِ اسلامی کو اس کے خلاف اقتصادی پابندیاں لگا کر اور نامشروع جنگیں مسلط کر کے اس نوخیز اسلامی انقلاب کو مفلوج کرنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں۔

کبھی یہ نام نہاد داعیٔ امن اپنے جنگی بیڑوں کو آزادی اور استقلال طلب ملکوں کے دروازوں پر کھڑا کر کے چیلنج دیتے ہیں اور کبھی یہ اپنی قاتل اور سفاک ایجنسیوں کو کہ جو مکر و فریب کے تربیت یافتہ افراد پر مشتمل ہوتی ہیں کھڑی کر کے کسی ملک کی آزادی طلب اور نشاۃِ اسلامیہ کی خیر خواہ تحریکوں کی مزاحمت کرتے ہیں۔

ذرا سوچیں اور بتائیں کہ ـــــــ

طاغوت اور آمریت کا اس سے بدتر اور کیا مظاہرہ ہو سکتا ہے کہ کسی کے گھر میں گھس کر اس کی جان و مال پر قابض ہو جائیں اور آزادی کے نام پہ آزادی ہی کا استحصال کریں۔

آئیے! اب ذرا اس نظامِ آزادی پر کہ جو مشرق اور کمیونزم نے انسان کو دیا ہے ایک نظر ڈال کر اس کے مکر و فریب کا بھی جائزہ لیں۔

ب: کمیونزم میں آزادی کا تصوّر

جیسا کہ سب جانتے ہیں کہ ـــــــ

کمیونزم کی دوسری بنیاد انسان کو ملکیت سے محروم کرنا ہے۔

اس نظام میں جہاں عوام کے خون پسینے کی کمائی سے حاصل کی ہوئی املاک کو نہایت سنگدلی اور بے رحمی کے ساتھ قومی ملکیت میں لے لیا جاتا ہے وہاں ساتھ ہی انسانوں سے ان کی آزادی کو بھی چھین لیا جاتا ہے۔

اس نظام میں حکومت کے افراد اور انتظامیہ کے علاوہ عوام کے ہر فرد کی حیثیت و قیمت کسی مشین کے پرزے سے زیادہ نہیں ہوتی۔

ان سے کارخانوں اور کھیتوں میں جبراً کام لیا جاتا ہے۔

وہاں کسی کو یہ حق نہیں کہ وہ اس نظام کے خلاف آواز اٹھا سکے۔

وہاں اس نظام کے خلاف آواز بلند کرنے والے کو گولی سے جواب دیا جاتا ہے۔

چنانچہ ابتدائی مراحل میں کمیونسٹ نظام کے عدالتِ اجتماعی کے نعروں سے فریب کھانے والوں کی جب آنکھیں کھلیں اور ان پر جب یہ انکشاف ہوا کہ یہ نظام انسانوں کے لیے عدل کی بجائے ظلم وجور اور انسانیت کی بجائے حیوانیت اور درندگی لے کر آیا ہے تو اس پر مزدور طبقے نے احتجاج کیا۔

اس احتجاج کا کیا انجام ہوا، کیا آپ جانتے ہیں؟

سنیئے!

احتجاجی مظاہرہ کرنے والوں میں قتل کیے جانے والوں کی تعداد ایک کروڑ، نوے لاکھ، جن کو سخت سزائیں دی گئیں ان کی تعداد بیس لاکھ، اور شہر بدر کیے جانے والوں کی تعداد چالیس اور پچاس لاکھ تک بتائی جاتی ہے۔

حقِ آزادیٔ انسان کو کس طرح رد کیا گیا اس کا شاہد ۱۹۲۱ء میں لینن کا وہ تقریری نشریہ ہے جس میں اس نے کہا کہ:

"بہت سے لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ قانون حریت کا محافظ ہے، ہم ان دیوانوں پر واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ قانون حریت کے تحفظ کے لیے نہیں بلکہ حکومت کے تحفظ کے لیے ہوتا ہے۔"

۱۹۳۵ء میں لینن نے اپنی تقریر میں کہا کہ:

"کمیونسٹ نظام پر ایمان نہ رکھنے والوں کے ساتھ ہم کسی رحم کا برتاؤ نہیں کریں گے۔"

یہی لینن ایک جگہ اعتراف کرتا ہے کہ :

" ہمارے نئے نظام کو ملک کی اکثریت کی تائید حاصل نہیں ہے۔"

اور پھر کہتا ہے کہ :

" ہم ان لوگوں پر رحم نہیں کریں گے ———"

ایک دوسری جگہ وہ کہتا ہے کہ :

" یہ بات مسلّم ہے اور سب لوگ جانتے ہیں کہ حزب بلاشفہ (اقلیتی پارٹی) حکومت پر ڈھائی سال بھی باقی نہیں رہ سکتی۔ بلکہ ڈھائی سال تو کیا اگر جبری اطاعت کا نظام نہ ہوا اور ہماری پارٹی میں فولادی قانون نہ ہو تو ڈھائی مہینے بھی ہم حکومت میں نہیں رہ سکتے۔"

(نقل از اسمس لینن)

چنانچہ ۱۹۲۰ء میں لینن نے صریحاً اعتراف کیا اور کہا کہ :

" ہم نے لوگوں کے ساتھ ظلم اور قساوت کا برتاؤ کیا۔"

کمیونسٹ نظامِ سیاست میں آمریت

یہاں پارلیمنٹ اور اقتدار اعلیٰ کے انتخاب میں ہر شخص ووٹ دینے کا حق نہیں رکھتا۔ بلکہ صرف پارٹی کے ممبران کو ہی یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ پارلیمنٹ کے ممبر یا وزیراعظم کا انتخاب کریں۔ اور نہ ہی ہر شخص کو پارٹی میں شمولیت کا آسانی سے حق ملتا ہے بلکہ کمیونسٹ نظام کے بہت سے ذہنی اور فکری تربیتی مراحل طے کرنے کے بعد بڑی تحقیق اور چھان بین کے بعد کسی شخص کو پارٹی میں لیا جاتا ہے۔

اس لحاظ سے کمیونسٹ پارٹی کے ممبران دوسرے لوگوں کے مقابلے میں کہ جو پارٹی کے ممبر نہیں ہیں ایک امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ پھر پارٹی کی انتظامیہ یا مرکزی کمیٹی کے ممبران کہ جن کا انتخاب پارٹی کے ممبران کرتے ہیں وہ خود پارٹی کے ممبران کے مقابلے میں ایک امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ مرکزی کمیٹی اپنی طرف سے تین کمیٹیاں بناتی ہے۔

○ ——— ایک مکتب سیاسی۔
○ ——— دوسری مکتب تنظیم۔
○ ——— تیسری کرتاریہ۔

کرتاریہ اعلیٰ اختیار کی مالک ہوتی ہے۔ اس سے کسی قسم کی باز پرس نہیں کی جا سکتی۔ بلکہ یہ کمیٹی سیاہ وسفید کی مالک ہوتی ہے۔

کرتاریہ ہی پارٹی کے جنرل سکریٹری کا انتخاب کرتی ہے جو ملک کا وزیر اعظم بھی ہوتا ہے اور مملکت کی باگ ڈور اس کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ اس طرح ملک کے سیاہ وسفید کا مالک پارٹی کا جنرل سکریٹری اور وزیر اعظم ہوتا ہے۔

اس نظام میں قانون یا رائے عامہ کا احترام تو کجا خود پارٹی کی بھی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ پارٹی ان کو منتخب کرنے کے بعد مرکزی کمیٹی کے رحم وکرم کا نظارہ کرتی رہتی ہے اور ہر وقت ان پر یہ خوف طاری رہتا ہے کہ نہ جانے کب مرکزی کمیٹی ان کی رکنیت کو پارٹی سے ختم کردے۔

جیسا کہ بتایا جاتا ہے کہ ۱۹۳۹ء میں پارٹی کے رسمی ممبران ڈھائی ملین تھے جبکہ پارٹی سے نکالے جانے والوں کی تعداد دو ملین تھی۔

اس بدترین آمریت کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ جس نے بھی اس کے خلاف آواز اٹھائی اس کو موت کی سزا نصیب ہوئی۔ چنانچہ ۱۹۳۲ء میں کمیونسٹ نظام کے دوسری اصلاح اراضی کے موقع پر احتجاج کے جرم میں مارے جانے والوں کے علاوہ بھوک

سے مرنے والوں کی تعداد چھ ملین بتائی جاتی ہے۔

(اقتصادنا۔ السید باقر الصدر۔ صفحہ ۲۴۸)

اس آمرانہ نظام میں سیاہ وسفید کا اگر کوئی مالک ہے تو پارٹی کی مرکزی کمیٹی۔ باقی رعایا کے افراد ہر قسم کی ملکیت سے محروم ہیں۔

آپ اس بات کو خلافِ واقعہ نہ سمجھیں۔

آج کمیونسٹ ملک روس میں رعایا کا کوئی فرد اگر کسی مختصر سی رہائش گاہ کا مالک بھی ہے تو وہ کسی شخصی آزادی کی وجہ سے یا قانونی حیثیت سے نہیں بلکہ قانون کی کمزوری اور قانون کی عدم توانائی کی وجہ سے وہ قانون کے ہاتھوں سے بچا ہوا ہے۔

اسی طرح روس میں خود مختار اور آزاد زندگی گزارنے والا اگر کوئی شخص ہے تو وہ پارٹی کے کرتا دھرتا کا ممبر یا پارٹی کا جنرل سکریٹری ہی ہے۔

ایک عام آدمی اپنے ملک کی سرحد سے باہر نہیں جا سکتا۔

عالمی خبریں نہیں سن سکتا ——— اپنے بچوں کے بارے میں کوئی اختیار نہیں رکھتا۔ حتیٰ کہ اپنی تقدیر کے بارے میں کوئی سوچ نہیں رکھ سکتا۔

ہاں! اگر خوبی یا امتیاز یا فرق ہے تو وہ یہ کہ ———

یہاں پارٹی اور وزیر اعظم کے جو اختیارات ہیں وہ غیر قانونی ہیں۔ جبکہ سرمایہ داری نظام میں وہ یہ اختیارات قانون کی رو سے رکھتے ہیں۔

یعنی کمیونزم میں آمریت کی شکل غیر قانونی اور سرمایہ داری نظام میں قانونی ہے۔ یہ دونوں آمریت اور طاغوت کے بدترین نمونے ہیں کہ جن کا تاریخ بشریت میں بیسویں صدی کے انسان کو سامنا ہے۔

ج: اسلام میں آزادی کا تصور

اگر خداوند متعال، رؤف و رحیم، دورِ قدیم کے انسان فروش معاشرے میں، غرور و تکبّر اور جہل و نادانی میں ڈوبے ہوئے ظلم و استکبار اور فتنہ و فساد کی آگ میں جلتے ہوئے انسانوں کے تاریک ماحول میں نورِ محمدیؐ کو فانوسِ رسالت میں مبعوث فرماکر زبانِ رسالتؐ سے یہ اعلان نہ کراتا کہ:

"اے انسانو! تم سب آدمؑ سے ہو اور آدمؑ مٹی سے ہیں۔ عرب کو عجم پر اور گورے کو کالے پر کوئی فضیلت نہیں۔ تمام انسان کنگھی کے دندانوں کی طرح ایک دوسرے کے مساوی ہیں اور یہ کہ کوئی انسان دوسرے انسان کو اپنا رب اور معبود نہ بنائے۔"

تو شاید انسانیت کبھی بھی آزادی و مساوات کی بُو نہ سونگھ سکتی۔ پیغمبر اکرمؐ نے سرزمین مکہ میں مبعوث ہونے کے بعد فقط خانہ کعبہ میں موجود بتوں اور لوگوں کی بغلوں میں موجود بتوں سے ہی نفرت کا مظاہرہ نہیں کیا اور فقط انسان فروشی کے بازاروں میں انسانوں کی خرید و فروخت پر ہی نکتہ چینی نہیں کی بلکہ بشریت کو ہر قسم کی قید و بند سے آزاد کرنے اور انسانیت کے سامنے ہر قسم کے بتوں کو توڑنے کے لیے کمربستہ ہو کر اپنے انسان ساز منشور کا ان الفاظ کے ساتھ اعلان فرمایا کہ:

"میں تمھارے لیے دین و دنیا کی بھلائی لے کر آیا ہوں۔"

اس عظیم محسنِ انسانیت نے لوگوں کو درپیش غلامی اور بندگی کے ایک ہی زاویہ کی طرف اشارہ نہیں کیا بلکہ بتایا کہ اس کے اور بھی زاویے موجود ہیں۔ جیساکہ امیرِ مکتبِ محمدی علی ابن ابی طالبؑ نے ارشاد فرمایا کہ:

" غلام تین قسم کے ہوتے ہیں :

- ایک غلام رق
- دوسرے غلام شہوت
- تیسرے غلام طمع و لالچ

صرف پیغمبر اکرمؐ ہی نہیں بلکہ بیتِ نبوت کے شاگرد اول بھی ہمیشہ انسان کو غلامی کے خطرے سے متنبہ کرتے رہے۔

کبھی فرماتے تھے کہ :

" خدا نے تمھیں آزاد پیدا کیا ہے تم کسی کے غلام نہ بنو۔"

اسلام صرف ایک انسان کو دوسرے انسان کی غلامی سے نجات دلانے پر ہی اکتفا نہیں کرتا۔ بلکہ خود اپنی معصیت، غلط اور برُے اعمال اور اپنے گناہوں میں رہن ہونے اور خواہشاتِ نفس کی غلامی سے آزاد رہنے کا درس بھی دیتا ہے۔

چنانچہ امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں :

" صاحبِ دین شہوات کو رَد کرتا ہے۔"

یا جیسا کہ امیرالمومنینؑ فرماتے ہیں کہ :

" آزاد وہ ہے جو شہوت کو ترک کرتا ہے "

—— یا ——

" وہ شخص کہ جو اپنے آپ کو فروخت کر کے ہلاکت میں ڈالتا ہے، اس شخص کے برابر نہیں ہو سکتا کہ جو اپنے آپ کو خرید کر آزاد کراتا ہے۔"

درہم و دینار اور متاعِ دنیا کی پرستش اور بندگی کی مذمت کرتے

ہوئے پیغمبر اکرمؐ فرماتے ہیں :

" ملعون ہے وہ ملعون ہے وہ جو درہم و دینار
کی پرستش کرتا ہے۔"

اور دوسری جگہ فرمایا کہ :

" غلام اگر قناعت کرے تو (حقیقتاً) وہ آزاد ہے،
اور آزاد اگر طمع و لالچ کرے تو (حقیقتاً) وہ غلام ہے۔"

اسی طرح کسی انسان کی اندھا دھند پیروی کرنے کی سختی سے ممانعت کی گئی ہے۔ خصوصاً وہ پیروی جب گناہ کے معاملے میں ہو تو پیروی کرنے والے کو غلام سے تعبیر کیا گیا ہے اگرچہ وہ ظاہراً آزاد ہو۔

چنانچہ امام صادق علیہ السلام نے فرمایا :

" اگر کسی شخص نے معصیت میں کسی کی پیروی کی تو
گویا اس نے اس کی بندگی کی۔"

(اصول کافی جلد دوم صفحہ ۳۹۸)

امام ایک دوسری حدیث میں فرماتے ہیں کہ :

" اگر کوئی شخص کسی بات کرنے والے کی طرف کان لگا کر
سنے تو گویا اس نے اس کی بندگی کو اپنا لیا۔ اب
اگر بات کرنے والا خدا کی بات کرتا ہے تو اس نے خدا
کی بندگی کو اپنایا اور اگر بات کرنے والا شیطان
کی بات کرتا ہے تو سننے والے نے شیطان کی
بندگی کو اپنایا۔"

(میزان الحکمہ جلد ۲ صفحہ ۳۵۱)

اسلام جو آزادی انسانیت کے لیے پیش کرتا ہے وہ اس آزادی سے بالکل مختلف ہے جو مغرب کا سرمایہ دارانہ نظام پیش کرتا ہے کہ جس میں بغیر کسی مہار اور لگام کے چند خونخوار درندہ صفت سرمایہ داروں کو پورے انسانی معاشرے کے خون چوسنے کا موقع فراہم کر کے ظالم و جابر کی پشت پناہی کی جاتی ہے اور ظلم و دہشت کو فروغ دیا جاتا ہے۔

اسلامی آزادی کا تصور اس تصور سے بھی بالکل مختلف ہے جو کمیونسٹ نظام، آزادئ حقیقی کے پرفریب نام سے اپنی رعایا کو دینے کا وعدہ کر کے آزادی جیسی بے نظیر اور بے مثال نعمت اور انسان اور انسانیت کو پامال کرتا ہے۔

آزادی کا جو تصور پیغمبر اسلام اور شریعتِ اسلام نے پیش کیا ہے وہ یہ ہے کہ خداوند عالم، پیغمبر اکرمؐ کو خطاب کر کے فرماتا ہے کہ

"وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ وقف
فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ ۚ وَمَنْ شَآءَ
فَلْيَكْفُرْ ۚ"

"اپنے رب کی طرف سے حق کی بات کرو جو چاہے
ایمان لائے جو چاہے کافر ہو جائے۔"

(سورۂ کہف آیت ۲۹)

"اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا
شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوْرًا"

" ہم نے سیدھا راستہ دکھا دیا ہے چاہے شاکر
نہیں چاہے کافر نہیں۔"

(سورۂ دہر۔ آیت ۳)

اپنے نبیؐ کے بارے میں کہ جو اس امت پر خداوند متعال کی طرف سے
حاکم ہیں ان سے خطاب ہے کہ :

" اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ لَسْتَ
عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ "

" آپ تو یاد دلانے والے ہیں ، آپ ان پر مسلط
نہیں ہیں۔"

(سورۂ غاشیہ۔ آیت ۲۱، ۲۲)

دوسری آیت میں ارشاد ہے :

" وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ "

" آپ ان پر جبار نہیں "

(سورۂ ق آیت ۴۵)

یہاں تک کہ تاریخ اسلام میں کوئی ایک مثال بھی نہیں ملے گی کہ جہاں کسی اہلِ کتاب کو اسلام قبول نہ کرنے کے جرم میں گرفتار کرکے اس پر ظلم و ستم کیا گیا ہو۔ یا قتل کیا گیا ہو۔

اسلام نے انسانی آزادی کو مطلق العنان اور بے لگام ہونے سے روکنے کے لیے تین رکاوٹیں اور حدود رکھی ہیں :

① خدا اور روزِ جزا پر ایمان

سب سے پہلے انسان کے باطن اور ضمیر میں یہ احساس پیدا کرنے کی کوشش کہ انسان خدا کو حاضر و ناظر سمجھے اور اس کا اس پر ایمان ہو کہ اس کا کوئی عمل خدا سے چھپا ہوا نہیں ہے اور وہ دلوں کے بھید سے بھی واقف ہے۔

اس کی ذرہ بھر نیکی اور ذرہ بھر برائی بھی اس کے نامۂ اعمال میں درج ہوتی ہے اور سزا و جزا کا ایک دن معین ہے کہ جس دن اسے اپنے اعمال کا جواب دینا ہے

ضمیر انسانی میں اس احساس کا بیدار ہونا اور عقیدہ میں پختگی ہر فرد مسلمان کو اس کی آزادی کی معین حدود سے تجاوز کرنے سے روکنے کا ایک بہت بڑا محرک اور سبب بنتا ہے۔

② امر بالمعروف اور نہی عن المنکر

اسلام نے ہر فرد مسلم کے لیے یہ واجب کیا ہے کہ

وہ بہتر اور احسن طریقے پر لوگوں کو نیکی کی طرف دعوت دے اور برائیوں سے روکے اور افراد معاشرہ کو خطا اور غلطیوں سے آگاہ و متنبہ کر کے ان سے لوگوں کو بچائے۔

چنانچہ اسلام کا تفویض کردہ یہ وظیفہ شرعی، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر انسانی معاشرے کو اس کی معینہ حدود میں رہنے اور نعمتِ آزادی کے غلط استعمال سے روکنے اور اس کے مطلق العنان ہونے سے بچانے کے لیے دوسرا ممد و معاون سبب اور ذریعہ ہے۔

③ مملکتِ اسلامیہ کے قوانین

لیکن اگر انسان کی سرکشی حد سے بڑھے اس کے دل سے خوف خدا اٹھ جائے

اور روز جزا و سزا پر ایمان باقی نہ رہے ــــــــــــــــ

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا اس پر کچھ اثر نہ ہو اور اس کے جرائم معاشرہ میں فساد پھیلنے کا سبب بننے لگیں، لوگوں کے حقوق برباد ہونے لگیں تو اسلامی حکومت کے قوانین آگے بڑھ کر سدّ راہ بنتے ہیں۔

اس لیے کہ ایسے شخص کو آزاد چھوڑ دینا اور کھلی چھٹی دے دینا معاشرے کے دوسرے افراد کے حقوق اور ان کی آزادی کو سلب کرنے کے مترادف ہے۔

اس لیے ضروری ہے کہ

مملکتِ اسلامیہ کے قوانین اپنا کردار ادا کریں اور ایسے ناپسندیدہ افراد کو لگام دے کر دوسروں کے حق آزادی کو بحال رکھنے کا سبب بنیں۔

اسلام میں ایسے قوانین کا موجود ہونا کوئی نئی اور انوکھی بات نہیں بلکہ دنیا کے ہر نظام میں ایسے قوانین ہوتے ہیں۔

مثال کے طور پر مغرب کا سرمایہ دارانہ نظام کہ جس کا ڈھانچہ ان کے زعم کے مطابق آزادی کی بحالی پر مبنی ہے وہاں بھی خود بحالی آزادی کے خلاف کسی کو آواز اٹھانے کا حق نہیں ہے۔

اگر اسلام نہ آتا تو انسانیت ہمیشہ غلامی کی زنجیروں میں جکڑی رہتی

قبل اس کے کہ ہم اس پر بحث کریں کہ اسلام نے انسانیت کی آزادی کے لیے کیا مساعی اور کوششیں کیں اور کون سی راہیں اختیار کیں، ضروری سمجھتے ہیں کہ ایک نظر اس سلسلہ اور ان حالات پر ڈالیں کہ ایک آزاد انسان کیسے اور کیونکر غلام بنا اور غلامی کے دور میں آیا۔

ہمیں طولِ تاریخ میں چار عوامل نظر آتے ہیں جو انسان کی غلامی کا سبب بنے:

○ لوٹ مار اور غارت گری

زمانۂ جاہلیت میں عرب ہمیشہ ایک دوسرے کے محلوں اور علاقوں میں جاکر اچانک لوٹ مار اور غارت گری کرتے تھے۔ اور مغلوب لوگوں کو غلام بنالیتے تھے یا راستے میں اگر کوئی ناواقف و ناآشنا مجہول الحال آدمی مل جاتا تو وہ اسے اپنا غلام بنالیتے تھے۔

○ قرضوں میں رہن افراد

اگر کوئی مقروض شخص معینہ مدت میں اپنا قرض نہ اتار سکتا تھا تو قرض دینے والا ایسے شخص کو غلام بنالیتا تھا۔

○ موروثی غلامی

وہ افراد جو نسلاً بعد نسلٍ غلام چلے آرہے تھے یعنی غلام و کنیز سے پیدا ہونے والے انسان ہمیشہ غلام رہتے تھے۔

○ جنگی قیدی

وہ لوگ جو باقاعدہ جنگوں کے دوران اسیر ہوجاتے تھے وہ غلام بنالیے جاتے تھے۔

ایسے افراد جو لوٹ مار اور غارت گری کے نتیجہ میں مغلوب ہو کر قیدی اور غلام بنالیے جاتے تھے یا دوسرے قسم کے وہ افراد جو قرضوں کی رہن میں غلام بنالیے

جاتے تھے۔ ان دونوں قسم کے افراد کے غلام بنائے جانے کو اسلام نے سب سے پہلے مسترد کیا اور اس کی سخت مذمت کی۔

البتہ موروثی غلامی کا سلسلہ اسلام سے قبل صدیوں سے چلا آرہا تھا کہ جس میں غلاموں اور کنیزوں کی فروخت کا باقاعدہ بازار لگتا تھا۔

اسلام نے اس صدیوں پرانے نظامِ غلامی کے ناسور کو یک لخت کاٹ کر نہیں پھینکا بلکہ حکیمانہ اور مدبرانہ انداز میں اس کا علاج کیا۔

اگر اس صدیوں پرانے نظام کو یکلخت ختم کر دیا جاتا تو وہ غلام اور کنیزیں جو کسی نہ کسی کی ملکیت میں چلے آرہے تھے وہ ہمیشہ غلام ہی رہتے اور ان کے آزاد ہونے کی کوئی سبیل نہ ہوتی اور یہ سلسلہ نسلاً بعد نسلٍ جاری رہتا۔

چنانچہ اسلام نے اس لعنت کو بتدریج جڑ سے ختم کرنے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا کہ ایسے غلاموں اور کنیزوں کو خرید کر اور ان کے مالکوں اور آقاؤں سے نجات دلا کر اسلام کے سایۂ عاطفت میں لایا جائے۔

غلاموں اور کنیزوں کو خریدنے کی اجازت دینے کے بعد اسلام نے بہت سے قوانین اس سلسلے میں پیش کیے۔ کچھ قوانین ایسے ہیں کہ جن کے تحت یہ غلام اور کنیزیں خود بخود آزاد ہو جاتے ہیں۔

وہ شرائط کہ جن کے تحت غلام خود بخود آزاد ہو جاتے ہیں

خدمت

اگر کوئی مومن غلام سات سال تک اپنے آقا کی خدمت کرے تو وہ آزاد ہوگا۔

معذوری

اندھا ، جذامی یا برص جیسے امراض میں مبتلا ہوجانے کے بعد غلام خود بخود آزاد ہوجائے گا۔

ملکیت

اگر کوئی مرد اپنے ماں باپ یا محرم عورتوں کا مالک بن جائے تو یہ خود بخود آزاد ہوجائیں گے ، اسی طرح اگر کوئی عورت اپنی ماں یا باپ یا محرم مردوں کی مالک بن جائے تو یہ خود بخود آزاد ہوجائیں گے۔

غلام کا اپنے آقا سے پہلے مسلمان ہوجانا

اگر کوئی غلام اپنے آقا سے پہلے مسلمان ہوجائے تو وہ آزاد ہوجائے گا۔

غلام کے والدین کا آزاد ہوجانا

اگر غلام کے والدین میں سے کوئی ایک آزاد ہوجائے تو یہ خود بخود آزاد ہوجائے گا۔

ضرب و تعذیب

اگر کوئی آقا اپنے غلام کو ایسی ضرب و تعذیب کرے کہ جس سے وہ جسمانی لحاظ سے معذور ہوجائے تو وہ غلام آزاد ہوجائے گا۔

اس کے علاوہ اسلام نے اپنے قوانین میں کچھ ایسے کفارے بیان کیے ہیں جو گناہ و عصیان سرزد ہو جانے کی صورت میں گناہ کا کفارہ بن کر قہر و غضب الٰہی سے نجات دلانے کا سبب ہوتے ہیں ان میں سے ایک کفارہ چند صورتوں میں غلام و کنیز کا آزاد کرنا بھی ہے، جیسے کہ :

کفّارۂ ظہار

اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے کہے کہ تیری پشت میری ماں کی پشت جیسی ہے تو اس کے کفاروں میں سے ایک متبادل کفارہ غلام کو آزاد کرنا ہے۔

روزہ توڑنے کا کفّارہ

اگر کوئی شخص رمضان کے مہینہ میں بغیر عذر شرعی کے روزہ توڑ دے تو اس کا کفارہ بھی لازمی طور پر ایک غلام کو آزاد کرنا ہے۔ اگر روزہ حرام مال سے افطار کیا جائے تو اس کا کفارہ بھی ایک غلام آزاد کرنا ہے۔

نذر کی خلاف ورزی کا کفّارہ

اگر کوئی شخص نذر کے خلاف کرے تو اس کے لیے معین کفاروں میں ایک متبادل کفارہ غلام کو آزاد کرنا ہے۔

وعدہ خلافی کا کفّارہ

اگر کوئی شخص وعدہ کی خلاف ورزی کرے تو کفاروں میں ایک متبادل کفارہ غلام کو آزاد کرنا ہے۔

قسم توڑنے کا کفّارہ

اگر کوئی شخص اپنی قسم توڑ دے تو اس کے لیے متبادل کفارہ غلام کو آزاد کرنا ہے۔

حد سے زیادہ جزع وفزع کرنے کا کفّارہ

اگر کوئی شخص کسی مصیبت پر حد سے زیادہ جزع وفزع کرے کہ جس سے یہ معلوم ہو کہ وہ قضائے الٰہی پر راضی نہیں ہے تو اس کا ایک متبادل کفارہ غلام کو آزاد کرنا ہے۔

غلام کو زدوکوب کرنے کا کفّارہ

اگر کوئی شخص اپنے غلام کو زدوکوب کرے تو اس کا کفارہ غلام کو آزاد کرنا ہے۔

قتلِ خطا کا کفّارہ

اگر کوئی شخص کسی کو خطا سے قتل کردے تو اس کا ایک متبادل کفارہ غلام کو آزاد کرنا ہے۔

ایلا

اگر کوئی شخص قسم کھائے کہ وہ اپنی بیوی سے مقاربت نہیں کرے گا۔ اور پھر اپنی قسم کو توڑ کر اس سے مقاربت کرے تو اس کا ایک متبادل کفارہ غلام

کو آزاد کرنا ہے۔

اسلام کچھ طریقوں اور راستوں کی بھی ہدایت فرماتا ہے کہ جس کے ذریعہ غلام خود کو آزاد کرا سکتے ہیں اور کچھ ایسے قوانین بھی پیش کرتا ہے کہ جن کے تحت بیت المال مسلمین سے ایک خاص حصہ غلاموں کو آزاد کرانے کے لیے معین کیا جائے۔

چنانچہ اگر کوئی غلام اپنے آقا سے یہ عہد و پیمان کرے کہ وہ اپنی قیمت اپنے آقا کو ادا کر دے گا تو یہ غلام جیسے جیسے اپنی قیمت ادا کرتا جائے گا اتنا ہی آزاد ہوتا جائے گا۔

عہد و پیمان کی صورت میں اپنی قیمت ادا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ غلام اپنے آقا سے کسب معاش کی اجازت لے اور اس کسب معاش میں سے خود اپنی قیمت ادا کر کے آزاد ہو جائے۔

دوسرا راستہ اسلام نے یہ رکھا ہے کہ حکومت اسلامی کے فنڈ سے کہ جس کا ایک ذریعہ زکوٰۃ و صدقات ہے۔ غلام کو زکوٰۃ دی جائے تاکہ وہ غلام اس زکوٰۃ سے اپنی قیمت ادا کر کے آزاد ہو جائے۔ چنانچہ حکومتِ اسلامی میں اسی مقصد کے لیے مالِ زکوٰۃ سے ایک حصہ مختص ہوتا ہے کہ جو غلاموں کو آزاد کرانے پر صرف کیا جائے۔

اس کے علاوہ بھی اسلام اجر و ثوابِ عظیم کی صورت میں غلاموں کو آزاد کرانے کی بہت زیادہ ترغیب دیتا ہے۔

جہاں تک جنگی قیدیوں کا مسئلہ ہے وہ ایک ایسا ناگزیر عمل ہے کہ جو انسانیت کے تاریک ترین اور وحشتناک دور سے لے کر آج کے متمدن اور ترقی یافتہ زمانے میں بھی موجود ہے اور اس وقت تک موجود رہے گا جب تک کہ اس کرۂ زمین سے ظلم و ستم اور جنگ و فساد کا خاتمہ نہ ہو جائے۔

یہ ظلم و جور کا سلسلہ اس وقت تک ختم نہ ہوگا جب تک مصلح عظیم اور

نجات دہندۂ بشریت ظہور فرما کر کرۂ ارض سے انسان پر انسان کی بالادستی قائم کرنے والے عناصر کا خاتمہ نہ کر دیں اور طاغوت کو صفحۂ ہستی سے مٹا کر تمام انسانوں کو پرچمِ توحید کے تلے جمع نہ کر دیں۔ اس وقت تک اسلام و کفر میں جنگ جاری رہے گی۔

بہر حال جنگ کے نتیجہ میں قیدی بنائے جانے والے افراد سے متعلق اسلام کے سامنے تین قابلِ امکان اور عمل پذیر راستے ہیں:

(۱) ——— جنگ کے دوران دشمن کے اسیر ہو جانے والے افراد کو فوراً اسی وقت دشمن کو واپس کر دیا جائے۔ یا اصلاً ایسا قانون بنا کر پابندی عائد کر دی جائے کہ دشمن کے افراد کو ہاتھ آجانے کی صورت میں اسیر ہی نہ بنایا جائے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ دشمن کی طاقت ویسی ہی رہے گی اور وہ پہلے ہی کی طرح قوی رہے گا۔ اس صورت میں وہ پھر پوری قوت سے اسلام پر حملہ آور ہو سکتا ہے۔ لہٰذا یہ طریقہ یقیناً غیر معقول ہے کہ دشمن کو ہمیشہ طاقت ور رکھا جائے۔ دوسری طرف دشمن کے ہاتھوں اسیر ہو جانے والے لشکرِ اسلام کے سپاہی ہمیشہ کے لیے غلامی میں چلے جائیں گے اور ان کی آزادی کے لیے کوئی چارہ باقی نہیں رہے گا۔

(۲) ——— دوسری راہ یہ ہو سکتی ہے کہ جنگ کے دوران مسلمان اپنے حریف کے جو افراد ہاتھ آئیں یعنی مسلمانوں کے ہاتھوں اسیر ہو جائیں ان کو وہیں موت کے گھاٹ اتار دیں لیکن یہ ایک غیر معقول، غیر مستحسن فعل ہے اور اسلام کہ جو انسانیت کے لیے رحم و کرم کا مجسمہ بن کر آیا۔ اس کے اصولوں کے منافی ہے۔

(۳) ــــــــ ان دو راہوں کے برعکس تیسرا راستہ یہ ہے کہ اسیر ہو جانے کے بعد ان جنگی قیدیوں کے ساتھ ہمدردی اور محبت کے انسانی سلوک کو اپنائیں۔

دوسرے مرحلے پر ان کو اچھی تعلیم اور صالح تربیت دے کر اس قابل بنا دیا جائے کہ وہ حریت کی راہوں پر گامزن ہو جائیں اور آزاد افراد کی صفوں میں شامل ہو جائیں۔

اس کے لیے اسلامی قوانین کے مطابق درج ذیل صورتیں ہیں:

ا:۔ صالح تربیت کے بعد یہ جنگی اسیر عہد و پیمان کے ذریعہ اپنی قیمت خود ادا کر کے رفتہ رفتہ آزاد ہو جائیں۔ یا:

ب:۔ سات سال تک خدمت انجام دے کر خود کو آزاد کرالیں۔ یا:

ج:۔ مسلمان انفرادی طور پر اپنے گناہوں کے کفارے میں ان کو خرید کر آزاد کرائیں۔ یا:

د:۔ افراد مومنین، اجر و ثواب عظیم کی خاطر ان اسیروں کو خرید کر آزاد کرائیں۔!

اس کے علاوہ ان کی آزادی کا ایک طریقہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دشمن کی قید میں چلے جانے والے مسلمان اسیروں کو ان جنگی اسیروں کے بدلے میں رہا کرا لیا جائے۔ یا پھر دشمن سے ہر ایک جنگی اسیر کے بدلے فدیہ لے کر انھیں آزاد کیا جائے اور اس طرح دشمن پر ایک اقتصادی کاری ضرب لگائی جائے تاکہ پھر دوبارہ دشمن کو مملکت اسلامی پر حملہ کرنے کی جرات نہ ہو۔

---

⑤ دورِ آمریت میں قبرستانوں کی آبادی
اور جیلوں کی رونق

آمریت اور طاغوت نے تاریخ انسانیت کی پیشانی کو جس قدر داغدار کیا ہے اس کا احاطہ کرنے اور بیان کرنے سے زبان اور قلم قاصر ہیں۔ البتہ ہم یہاں تاریخ کے مختلف ادوار کے فقط دو نمونے پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں :

○ —— دورِ قدیم میں ولید بن عبدالملک کے مسلط کردہ حاکم حجاج بن یوسف کے بیس سالہ دورِ آمریت میں جنگ وجدال کے نتیجے میں قتل ہونے والوں کی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار تھی اور اس کے مرنے کے بعد اس کے زندان میں محبوس قیدیوں کی تعداد پچاس ہزار مردوں اور تیس ہزار عورتوں پر مشتمل تھی جس میں سے سولہ ہزار برہنہ تھیں۔

(کتاب شیعہ والحاکمین صفحہ ۹۸
نقل از مروج الذہب)

اسی طرح حجاج بن یوسف کے ہاتھوں قنبر، غلام امیرالمومنینؑ ، کمیل ابن زیاد نخعی اور سعید ابن جبیر صحابیٔ امام سجادؑ جیسی برگزیدہ ہستیاں شہید ہوئیں۔

○ —— دورِ حاضر سے کیمونسٹ انقلاب کی مثال موجود ہے جو بغیر کسی شرم و حیا کے اپنی حکومت کو پرولتار اور ڈکٹیٹر حکومت کہتا ہے۔

" ۱۹۲۸ء اور ۱۹۳۰ء کے درمیان دوبارہ شخصی ملکیت میں موجود املاک کو قومی ملکیت میں لینے کا فیصلہ ہوا تو اس کی مزاحمت میں ہونے والے مظاہروں میں قتل ہونے والوں کی تعداد

خود کمیونسٹوں کے احصا اور شمار کے مطابق ایک لاکھ بتائی جاتی ہے۔ جیل میں قید ہونے والوں کی تعداد قطعاً اس سے کئی گنا زیادہ ہے۔ کمیونسٹ حکومت میں موجود سنسر شپ کی وجہ سے اس کی صحیح تعداد کا اندازہ لگانا ایک مشکل کام ہے۔"

(کتاب اقتصادنا۔ صفحہ ۲۴۸)

⑥ آمریت میں ضمیر مُردہ ہو جاتے ہیں

طاغوت و آمریت جس چیز سے ہمیشہ لرزاں اور ترساں رہتی ہے وہ قوموں کی بیداری اور انقلابی حس ہے۔ لہٰذا اس کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی ہے کہ قوم کے ضمیر مُردہ رہیں اور ان کی انقلابی حس بیدار نہ ہو پائے۔

اس کے لیے وہ ہر وہ ذریعہ اور ہر وہ وسیلہ اختیار کرتے ہیں کہ جو انسانی ضمیر کو سُلا دینے اور مردہ کرنے میں ممد اور معاون ہو۔ وہ ہمیشہ ایسے عوامل کو ملت میں وسیع پیمانے پر پھیلانے کی کوشش میں مصروف رہتے ہیں جو افراد ملت کے ضمیر کو بے حس اور مُردہ بنانے میں مددگار ہوں۔

ہم ذیل میں چند ایسے اسباب اور عوامل کا ذکر کریں گے کہ جو انسانی ضمیر کو مردہ اور بے حس بناتے ہیں:

الف: فقر

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

"فقر، کفر سے نزدیک ہے۔"

(بحار الانوار۔ جلد ۷۲، صفحہ ۳۰۰)

پیغمبرِ اکرمؐ فرماتے ہیں کہ :
" اگر میرے رب کا رحم وکرم میری امت کے فقراء پر نہ ہوتا تو فقر، کفر سے نزدیک تھا۔"
(میزان الحکمہ۔ جلد ۴۔ صفحہ ۵۰۵)

پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ :
" فقر چہرے کو دنیا وآخرت میں سیاہ کرتا ہے۔"
(میزان الحکمہ۔ جلد ۴۔ صفحہ ۵۰۵)

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ :
" فقر انسان کے لیے موتِ اکبر ہے۔"
(نہج البلاغہ۔ حکم ۱۶۳)

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ :
" فقر، عاقل کو اپنی دلیل میں گنگ کرتا ہے۔"
(میزان الحکمہ جلد ۴ صفحہ ۵۰۵)

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ :
" فقر، قتل سے بدتر ہے۔"
(میزان الحکمہ جلد ۴۔ صفحہ ۵۰۵)

پیغمبرِ اکرمؐ فرماتے ہیں کہ :
" فقر، نفس کو بے حس بناتا ہے، عقل کو پریشان کرتا ہے اور تمام ہمّ وغم کا مرکز ہے۔"

حضرت امیر علیہ السلام نے امام حسن علیہ السلام سے فرمایا کہ:

"اے بیٹا! جو فقر میں مبتلا ہوتا ہے وہ ان چار خصلتوں کا شکار ہو جاتا ہے:

(۱) —— یقین میں ضعف

(۲) —— عقل میں کمی

(۳) —— چہرے پر حیا کی قلّت

(۴) —— دین میں سُبکی

اس لیے ہم فقر سے پناہ مانگتے ہیں"

(بحارالانوار۔ جلد ۷۲۔ صفحہ ۴۷)

حضرت امیر علیہ السلام نے محمد حنفیہ سے فرمایا کہ:

"میں تمھارے بارے میں فقر سے بہت ڈرتا ہوں فقر سے پناہ مانگو، فقر دین میں نقص لاتا ہے۔ عقل میں دہشت لاتا ہے اور ہلاکت کی دعوت دیتا ہے۔"

معصومؑ سے مروی ہے:

"خداوندِ عالم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو وحی کی:

"اے ابراہیمؑ! میں نے تمھیں خلق کیا، آتشِ نمرود سے تمھارا امتحان لیا۔ لیکن اگر ہم تمھارا فقر سے امتحان لیتے اور تم سے صبر کو لے لیتے تو تم کیا کرتے؟"

حضرت ابراہیمؑ نے جواب دیا کہ:

"خداوندا! فقر میرے لیے نارِ نمرود سے زیادہ

سخت ہے۔"

لقمان نے اپنے بیٹے سے وصیت میں کہا کہ:

"میں نے صبر کو چکھا اور تلخیوں کی اقسام کو بھی چکھا
لیکن فقر سے زیادہ تلخی کسی میں نہیں پائی۔"

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ:

"چار چیزیں انسان کی کمر توڑ دیتی ہیں ان میں سے
ایک وہ فقر ہے جس کا علاج نہ ہو۔"

(میزان الحکمہ۔ جلد ۴۔ صفحہ ۵۰۵)

حضرت امیر علیہ السلام نے اپنے فرزند امام حسن علیہ السلام سے فرمایا کہ:

"اس انسان کو ملامت مت کرو جو اپنے ہر روز کی
روزی حلال طریقے سے مہیا کرنے میں مشغول ہو
جو شخص روزانہ اپنی روزی کا بندوبست نہ کرسکتا ہو
اس سے بہت سی غلطیاں سرزد ہوتی ہیں۔"

آپؑ نے فرمایا کہ:

"اے بیٹا! فقیر، حقیر ہے۔ اس کی بات کو نہ
سُنا جاتا ہے اور نہ اس کے مقام کو پہچانا جاتا
ہے، اگر وہ سچا ہے تو جھوٹا سمجھا جاتا ہے اور اگر
وہ زاہد ہے تو اسے جاہل سمجھا جاتا ہے۔"

(میزان الحکمہ جلد ۴۔ صفحہ ۵۰۴)

ان روایات میں فقر کو کبھی کفر، کبھی موتِ اکبر، کبھی دنیا و آخرت میں چہرے کو سیاہ کر دینے والا۔ کہیں عاقل کو گونگا بنانے والا، کہیں نفس کو بے حس اور

عقل کو پریشان کر دینے والا اور کہیں بے حیائی اور نابودی کی طرف دعوت دینے والا بتایا گیا ہے۔ کبھی فقیر سے خطاؤں کے زیادہ سرزد ہونے کی تشویش کا اظہار کیا گیا ہے کبھی اس کو کمر توڑنے والی مصیبت سے تعبیر کیا گیا ہے اور کہیں فقر کو نارِ نمرود سے زیادہ ہولناک بتایا گیا ہے کہ جو ابراہیم خلیل اللہ جیسی ہستی کے لیے بھی گراں اور مشکل ہو۔

غور کیجیے!

کہ اگر کسی قوم اور ملت میں "فقر" جیسی نحوست آجائے کہ بقول معصومؑ جس کے اتنے بُرے نتائج ہوں تو کیا اس قوم کا جمود توڑنا اور اس میں انقلابی حس بیدار کرنا ممکن ہے ______ ؟

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ آمرانہ اور طاغوتی نظام میں حاکموں کی ہر ممکن کوشش یہ ہوتی ہے کہ معاشرے میں معاشی دشواریاں پیدا کی جائیں اور قوم کی انقلابی حس کی بیداری اور ملت میں احساسِ مسؤلیت کے بیدار ہو جانے کے خطرے سے بچنے کے لیے ہمیشہ قوم کو معاشی پریشانیوں اور فقر جیسی بلا میں مبتلا رکھا جائے۔ مامنی میں جس کی ایک مثال ذیل کے واقعہ سے ظاہر ہوتی ہے۔

"ہارون الرشید جب مدینہ پہنچا تو اس سے ملنے کے لیے آنے والوں میں امام موسیٰ ابن جعفر بھی تھے۔ ہارون نے امامؑ کو بہت سے عطیات دینے کا وعدہ کیا۔

جب وہ مدینہ سے جانے لگا تو انصار اور مہاجرین کی اولاد میں سے ہر ایک کو پانچ ہزار دینار دیے لیکن امام موسیٰ ابن جعفر کو صرف پانچ سو دینار دیے۔

مامون نے اعتراض کیا اور ہارون الرشید سے کہا کہ:

"اس شخصیت کی اتنی تعظیم و تکریم کرنے کے بعد سب سے کم رقم

کیوں دی؟"

ہارون نے غصہ سے کہا کہ:

"خاموش رہو! اگر میں اس کو وہ کچھ دے دوں جو میں نے وعدہ کیا تھا تو مجھے ان ایک لاکھ تلواروں کے خطرے سے امن نہیں جو ان کے دوست اور موالی مجھ پر اٹھائیں گے۔ ان کے ہاتھ کھلے رہنے کے برعکس ان کے اور ان کے خاندان کا فقر ہی میری اور تمھاری سلامتی کا موجب ہے۔"

(حیاتِ موسیٰ ابن جعفر جلد ۲۔ صفحہ ۲۴۴
نقل از بحار الانوار جلد ۱۱ صفحہ ۲۷۰)

ب: جہالت

حضرت علی علیہ السلام سے مروی ہے کہ:

"جہالت موت ہے اور سستی فوت ہے۔"

(میزان الحکمہ جلد دوم صفحہ ۱۵۳)

حضرت علی علیہ السلام سے مروی ہے کہ:

"جہل انسانی بدن میں آنے والے جراثیم سے زیادہ خطرناک ہے۔"

(میزان الحکمہ۔ جلد دوم۔ صفحہ ۱۵۳)

حضرت علی علیہ السلام سے مروی ہے کہ

"جہل بیماری ہے اور سستی ہے۔"

آپؑ ہی سے مروی ہے کہ :

" جہالت تمام بیماریوں کی ماں ہے ۔"

(میزان الحکمہ جلد دوم صفحہ ۱۵۳)

آپؑ ہی سے مروی ہے :

" جہل زندوں کو مردہ کرتا ہے اور شقاوت کا بیمہ کرتا ہے ۔"

آپؑ ہی سے مروی ہے :

" جاہل اپنی تقصیر کو نہیں جانتا اور نہ اپنے ناصح کی نصیحت کو قبول کرتا ہے ۔"

آپؑ ہی سے مروی ہے :

" جاہل میت ہے اگرچہ دیکھنے میں زندہ نظر آتا ہے ۔"

آپؑ ہی سے مروی ہے :

" جاہل اپنی جہالت سے باز نہیں آتا اور موعظہ اسے کوئی فائدہ نہیں پہنچاتا ۔"

آپؑ ہی سے مروی ہے :

" جاہل وہ پتھر ہے جس سے پانی نہیں نکلتا ۔"

آپؑ ہی سے مروی ہے :

" جاہل وہ درخت ہے جس کا تنا سرسبز نہیں ہوتا اور جاہل وہ زمین ہے جس سے سبزہ نہیں اگتا ۔"

(میزان الحکمہ جلد دوم صفحہ ۱۵۳)

معصوم کے ان اقوال میں جہالت کو موت ، سستی ، خطرناک جراثیم ، بیماری

شقاوت، اپنی تقصیر پر اَڑنے والا، نصیحت قبول نہ کرنے والا، میت، وہ پتھر جس سے پانی نہ نکل سکتا ہو اور ویران اور بنجر زمین سے تعبیر کیا گیا ہے۔

جس معاشرے میں جہالت کا دور دورہ ہو کہ جو ان تمام برائیوں، بدبختی اور شقاوت کی موجب ہے اس معاشرے کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنا اور اس کے جمود کو ختم کرنا اور اس قوم میں انقلابی حِس کو جگانا کسی معجزے سے کم نہیں۔

آمرانہ اور طاغوتی نظام میں ہمیشہ یہ کوشش رہتی ہے کہ قوم جہالت کی تاریکی سے نہ نکلنے پائے چنانچہ دورِ بنی امیہ میں نقلِ احادیث پر پابندی، علمی شخصیات کا فقدان اور روایات کو صرف بنی امیہ کے فضائل تک محدود رکھنا اس کا واضح ثبوت ہے۔ علم کشی اور علمی شخصیات کو ابھرنے نہ دینا آمریت کا خاصہ ہے۔

ج: کفر

طاغوت اور آمریت کا نظام اور اس کی بقا چونکہ کفر باللہ پر مبنی ہوتا ہے لہٰذا طاغوت ہمیشہ امت کو نورِ ھدایت سے ظلم کی تاریکی کی طرف لے جاتا ہے۔

"وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓـُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ"

"کافروں کے ولی طاغوت ہیں جو انھیں نور (ہدایت) سے نکال کر تاریکیوں کی طرف لے جاتے ہیں۔"

(سورۂ بقرہ آیت ۲۵۷)

"وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ"

"ہماری آیتوں کو نہیں جھٹلاتے مگر ظالمین۔"

(سورۂ عنکبوت آیت ۴۹)

"وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَأْكُلُوْنَ كَمَا تَأْكُلُ الْأَنْعَامُ."

"جو کافر ہیں وہ لذت اٹھاتے اور کھاتے ہیں جس طرح حیوان کھاتے ہیں۔"

(سورۂ محمد۔آیت ۱۲)

طاغوت اور آمریت معاشرے میں کفر پھیلاتی ہے اور جہاں کفر آجائے وہاں سے انسانیت رخصت ہوجاتی ہے اور حیوانیت کا راج ہوتا ہے۔ کفر کے بارے میں احادیث ملاحظہ فرمائیں:

حضرت علی علیہ السلام سے مروی ہے:

"دنیا کافر کی جنت ہے، مال دنیا اس کی ہمت (کا سبب) ہے، موت اس کے لیے شقاوت ہے، جہنم اس کی منزل ہے۔"

(میزان الحکمہ جلد ۷ صفحہ ۱۰۴)

آپؑ ہی سے مروی ہے:

"کافر کی ہم و غم دنیا ہے، اس کی سعادت اس دنیا میں ہے اس کی غایت اس کی شہوت ہے۔"

(میزان الحکمہ جلد ۷ صفحہ ۱۰۴)

آپؑ ہی کا ارشاد ہے:

"کافر جاہل ہے۔"

(میزان الحکمہ جلد ۷ صفحہ ۴۱۰)

آپؑ ہی کا فرمان ہے:

"کفر چار ستونوں پر قائم ہے:

(۱) —— فسق

(۲) —— سرکشی

(۳) —— شک

(۴) —— شُبہ"

(نہج البلاغہ۔ حکم ۳۱

بحار الانوار۔ جلد ۷۷۔ صفحہ ۹)

آپ ہی سے مروی ہے:

"کفر کے چار ستون ہیں:

(۱) —— جفا

(۲) —— اندھاپن

(۳) —— غفلت — اور

(۴) —— شک۔"

(میزان الحکمہ جلد ۷۔ صفحہ ۴۱۰)

موت سے فرار، زر پرستی، شہوت پرستی، فسق، شک و شبہ، اندھاپن اور غفلت جو مردہ دلی کی نشانی ہے۔ یہ سب کفر کے آثار ہیں۔

جس معاشرے پر کفر حاوی ہو یقیناً یہ آثار بھی اس معاشرے پر چھائے ہوئے ہوں گے لہٰذا ایسے معاشرے میں بھی انقلابی حِس کی بیداری کے امکانات ختم ہو جاتے ہیں۔

اور جہاد فی سبیل اللہ کی تڑپ اور شہادت کی تمنا ختم ہو جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ خلفائے بنی امیہ اور خلفائے بنی عباس نے امت مسلمہ کے عقیدۂ راسخ کو متزلزل کرنے کی غرض سے ایسے مذاہب کی اختراع کی جو کفر سے نزدیک تھے اور قوم کے احساس بیداری کو ختم کرنے اور ضمیر انسانی کو مُردہ کرنے کی غرض سے مجبّرہ، مرجیہ یا زندیق اور ملحدین کو اسلامی معاشرے میں الحاد پھیلانے کی کھلی چھٹی دے دی۔

۵: لہو ولعب کا فروغ

آمر حکمران اپنی حکومت واقتدار کی بقا و دوام کے لیے اور اپنے ظلم وجور سے دوسروں کی توجہ ہٹانے کے لیے ایسے بے ہودہ مشغلے اور بے مقصد مصروفیات معاشرے میں رائج کر دیتا ہے جس سے نہ دین پنپنے پائے اور نہ ہی دنیا آباد ہو۔

اور کھیل کود اور بے ہودہ کاموں کے فروغ پر مسلمانوں کے خزانے سے کروڑوں روپیہ خرچ کر دیا جاتا ہے جیسا کہ دورِ حاضر میں بھی لوگوں کی توجہ اہم اجتماعی اور سیاسی معاملات سے ہٹانے کے لیے کھیل کود کا لامتناہی سلسلہ شروع کر دیا جاتا ہے۔

> "بنی امیہ کے دورِ اقتدار میں بھی لوگوں کے ذہنوں کو بیہودہ کاموں کی جانب متوجہ رکھنے کی خاطر معاویہ ابن ابی سفیان نے ایک فرمان جاری کیا کہ ہر مسجد میں نمازِ صبح کے بعد حمد خدا اور خلیفہ کے حق میں دعا کرنے کے بعد لوگوں کو قصے کہانیاں سنائی جائیں۔"

(ثورۃ الحسین۔ مہدی شمس الدین صفحہ ۱۱۹

نقل از حجر اسلام صفحہ ۵۹)

آمرانہ نظام میں فقر وفاقہ، معاشی بدحالی، جہالت، ظلم وستم وغیرہ کو اگرچہ

قانونی طور پر تو فروغ نہیں دیا جاتا لیکن قوم کو رشوت کے خاتمہ، سستا اور جلد انصاف فراہم کرنے، اقتصادی بہتری، تعلیم کے فروغ اور بے روزگاری کے خاتمہ کے عنوان سے دھوکہ اور طفل تسلیاں دی جاتی رہی ہیں۔

اس کے برعکس عملی طور پر ایسی پالیسیاں اپنائی جاتی ہیں کہ لوگ ہمیشہ فقر و فاقہ اور اپنی معاشی پریشانیوں میں مبتلا رہیں اور تعلیم سے بے بہرہ اور جہالت اور نادانی کا شکار رہیں تاکہ قوم کی سیاسی سوجھ بوجھ اور بصیرت ختم ہو جائے۔

ان کی ہمیشہ یہ کوشش رہتی ہے کہ معاشرے میں ظلم و ستم کا بازار گرم رہے، ظلم و زیادتی کرنے والے زیادہ ہوں اور ان کے ہمنوا اور ہم خیال افراد کی کثرت ہو، تاکہ خود حکام کی اپنی غلطیوں اور سیاہ کاریوں پر پردہ پڑا رہے۔

یہ خون چوسنے والے عناصر اگر کسی قوم و ملت پر چھا جائیں اور غالب آ جائیں تو ان کی برائیوں کے نتیجہ میں پھیلنے والے اثرات سے محفوظ رہنا، آزادی کی حرارت کو باقی رکھنا اور انقلابی حس کو تحفظ فراہم کرنا اور اس کو زندہ رکھنا تقریباً ایک ناممکن عمل ہے ملت کا ہر فرد ان اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ اگر محفوظ رہ سکتا ہے تو ایسی ہی صفت کا مومن کہ جس کے بارے میں ائمہؑ فرماتے ہیں کہ:

"مومن ایک فولاد ہے بلکہ فولاد کو اگر آگ میں جلایا جائے تو شاید وہ پگھل جائے لیکن مومن نہیں پگھل سکتا۔"

وہ مومن ہی محفوظ رہ سکتا ہے کہ جس کے بارے میں معصومؑ فرماتے ہیں کہ:

"مومن ایک پہاڑ ہے جسے جتنا بھی توڑا جائے اس میں کمی واقع نہیں ہوتی۔"

وہ مومن محفوظ رہ سکتا ہے کہ جس کے بارے میں امامؑ فرماتے ہیں کہ:

"سخت سے سخت آندھیاں اس کو ہلا نہیں سکتیں۔"

چنانچہ ائمہ اطہار کے فرامین میں وارد ہوا ہے کہ:

"جو ہمارے ساتھ ہماری پیروی میں رہنا چاہتا ہے، اس کو ہر قسم کی بلا اور مصیبتوں کے لیے آمادہ اور تیار رہنا چاہیے۔"

اصحاب حسین ابن علیؑ جیسی ہستیاں ان آندھیوں سے محفوظ رہ سکتی ہیں کہ جہاں مسلم ابن عوسجہ اٹھ کر کہتے ہیں:

"اے فرزندِ رسولؐ! اگر میں جانتا کہ میں قتل ہو جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں، پھر زندہ جلایا جاؤں، یہاں تک کہ ستر مرتبہ مجھے زندہ کیا جائے اور زندہ جلایا جائے تب بھی میں آپؐ سے جدا نہیں ہوں گا۔"

جہاں زہیر ابن قین کہتے ہیں کہ:

"مجھے قتل کیا جائے پھر زندہ کیا جائے پھر قتل کیا جائے۔ اسی طرح سو بار مجھے زندہ کیا جائے اور قتل کیا جائے اور اس سے آپؑ کی اور آپؑ کے اہلبیتؑ کی جان بچ جائے تو میں اس طرح قتل ہو جانے کو زیادہ پسند کروں گا اور ترجیح دوں گا۔"

خدانخواستہ اگر کسی معاشرے پر فکری جمود اور بے حسی طاری ہو جائے تو اس کے احساس کو بیدار کرنا اور اس کے جمود کو ختم کرنا کوئی آسان کام نہیں، جب تک کہ ملت کے روحِ رواں، منتخب اور چنیدہ شخصیات صفِ اوّل میں آگر پہل نہ کریں اور طاغوت سے ٹکرا نہ جائیں۔ جب تک کہ عبداللہ عفیف جیسی ہستی کہ جو آنکھ سے نابینا

لیکن قلب سے بالبصیرت تھی اور رشید ہجری، میثم تمار اور حجر ابن عدی جیسی شخصیات حسین ابن علیؑ جیسی شخصیت کی قیادت میں اپنے خون کی دھار سے جمود کو دُور کرکے اس پردے کو چاک نہ کردیں۔

۷: ظلم

آمر اپنی حکومتوں کی بقا کی خاطر ہر قسم کے ظلم وستم اور زور وزیادتی کو جائز تصور کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں نہ صرف وہ خود کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھتے بلکہ اپنے کارندوں کو بھی اس پر مامور کرتے ہیں اور اس سلسلے میں انھیں کھلی چھوٹ اور خاص ترغیب دیتے ہیں۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے:

" ظالم کی تین نشانیاں ہیں:

(۱) ـــــ اپنے سے کم تر پر ظلم،

(۲) ـــــ اپنے برتر کی نافرمانی،

(۳) ـــــ اپنے جیسے ظالم کے ساتھ تعاون۔"

آپؐ ہی سے مروی ہے:

" جو شخص اس دارِ بقا کے بدلے اِس دارِ فانی پر راضی ہوگیا اس نے اپنے نفس پر ظلم کیا۔"

آپؐ ہی کا ارشاد ہے:

" وہ شخص کسی دوسرے کے بارے میں عدل کو کیسے اپنائے گا جو خود اپنے نفس پر ظلم کرتا ہو۔"

آپؐ ہی نے فرمایا کہ:

"جو شخص اپنے نفس پر ظلم کرتا ہے وہ دوسروں پر
زیادہ ظالم ہوگا۔"

آپؑ ہی سے مروی ہے :

"ظلم تمام برائیوں کی ماں ہے۔"

(میزان الحکمہ جلد ۵ صفحہ ۶۰۸)

جس معاشرے میں ظلم کا دور دورہ ہو اور عدل و انصاف کی امید و توقع نہ ہو تو وہاں بھی انقلابی حس سو جاتی ہے اور ضمیر مردہ ہو جاتے ہیں۔

صلح امام حسنؑ کے بعد معاویہ کی طرف سے جاری ہونے والے ایک حکومتی فرمان میں جو تمام گورنروں کو جاری کیا گیا تھا یہ لکھا تھا کہ

"میں اس شخص کے ذمہ سے برأت کرتا ہوں جو ابوتراب
اور اس کے اہلبیت علیہم السلام کے فضائل بیان کرے"

(ثورۃ الحسینؑ۔ مہدی شمس الدین صفحہ ۱۵۷)

معاویہ نے سفیان بن عوف غامدی کو جو اس کی فوج کے جرنیلوں میں سے تھا بلا کر کہا :

"میں تجھے کثیر تعداد میں مسلح فوج دے کر بھیج رہا ہوں
تاکہ تو جہاں سے بھی گزرے قتل و غارت گری کر۔ یہاں
تک کہ یہ غارت گری کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے عراق
میں داخل ہو جا۔ وہاں پہنچنے کے بعد جو بھی تیری رائے
اور مذہب پر نہ ہو اس کو قتل کر اور جتنے بھی گاؤں ملیں
انھیں اور ان کے گھروں کو ویران کر اور مال کو غارت کر
یہ ان کے دلوں میں زیادہ رعب اور وحشت

طاری کرے گا۔"

(شرح نہج البلاغہ جلد ۲ صفحہ ۸۵
ثورۃ الحسین صفحہ ۶۷ مہدی شمس الدین)

معاویہ نے بسر ابن ارطاۃ کو بلایا، یہ بھی اس کے فوجی جنرلوں میں سے تھا اس کو حجاز و یمن کی طرف بھیجا اور اس سے کہا:

" ان دو شہروں میں جہاں سے بھی گزرو اور جس کسی علیؑ کے ماننے والے کو پاؤ اس کو یہاں تک سب و شتم کرو کہ وہ خیال کریں کہ ان کے لیے نجات نہیں اور تم ان پر مسلط ہو اور ان کو میری بیعت کی دعوت دو اس دعوت سے انکار کرنے والے کو قتل کردو۔ اور شیعیان علیؑ میں سے جو بھی ملے اسے قتل کردو۔"

معاویہ کی ہدایت کے مطابق بسر نے مکہ و مدینہ میں تیس ہزار افراد کو قتل کرایا۔ یہ ان کے علاوہ ہے جو آگ میں جلائے گئے۔"

(ثورۃ الحسین صفحہ ۶۸۔ مہدی شمس الدین
نہج البلاغۃ جلد دوم۔ ابن الحدید صفحہ ۱۷)

لوگ اس ظلم و بربریت کے خلاف کوئی آواز نہیں اٹھاتے تھے۔ اس لیے کہ اس قتل و غارت گری کے نتیجہ میں لوگوں کے ضمیر اور انقلابی حس مردہ ہو چکی تھی چنانچہ اس کے بیس سالہ دور حکومت میں اس کے خلاف کسی قسم کی آواز نہیں اٹھی بلکہ ہر شخص نفسا نفسی کا شکار تھا۔

خلاصۂ کلام

غرض آمریت تمام برائیوں اور جرائم کی جڑ ہے اور نظامِ آمریت تمام منکرات اور فاحشات کا سرچشمہ ہے۔

جیسا کہ محمد ابن منصور نے امام موسیٰ ابن جعفر علیہ السلام سے اس آیت کی تفسیر پوچھی کہ جہاں خداوند عالم فرماتا ہے کہ:

"قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ"

(سورۂ اعراف ۷، آیت ۳۳)

امامؑ نے فرمایا کہ:

"قرآن کے لیے ایک ظاہر ہے اور ایک باطن جو کچھ خداوند عالم نے قرآن میں حرام قرار دیا ہے جیسے کہ زنا، چوری وغیرہ وہ قرآن کا ظاہر ہے جبکہ باطن میں اس سے مراد ائمۂ جور اور حکامِ مستبد ہیں اور جو کچھ خدا نے قرآن میں حلال قرار دیا ہے یا جس کا خداوند عالم نے حکم دیا ہے جیسے نماز، روزہ، حج وغیرہ وہ قرآن کا ظاہر ہے اور باطن میں اس سے مراد امامِ عادل اور ائمۂ حق ہیں۔"

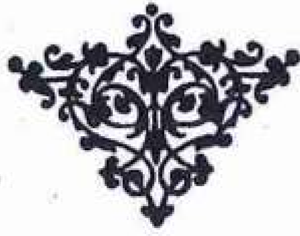
(اصول کافی جلد اول صفحہ ۳۷۴)

چنانچہ وہ افراد و احزاب جو انسانی معاشروں میں فلاح و اصلاح کا پروگرام

رکھتے ہیں انھیں اس بات سے صرفِ نظر نہیں کرنا چاہیے کہ اس راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ آمرانہ طرزِ اقتدار اور مختلف آمرانہ نظام ہیں۔ اسی لیے جب تک یہ نظام حاکم ہیں اس وقت تک صلاح و فلاح کے سلسلہ کی تمام کوششیں بے سود ثابت ہوں گی۔

لٰہذا اصلاح و فلاحِ انسانیت کے داعیوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ آمرانہ طرزِ حکومت اور اس سلسلہ میں معاون نظاموں کے خلاف کام کریں اور انھیں جڑ سے اکھاڑ پھینکیں۔

اس سلسلہ میں روشن ترین مثال سید الشہدار امام حسین علیہ السلام ہیں کہ جنھوں نے انسانیت کو ظلم و ستم اور جبر و استبداد کے چنگل سے آزاد کرانے کی خاطر اس دور کے آمروں سے ٹکر لی اور غیر صالح قیادت کی سرکوبی کے لیے قیام کیا۔



آمریت کیخلاف ائمہ طاہرینؑ کا جہاد

اس مسئلہ سے متعلق کہ مسندِ اقتدار سے محروم کیے جانے اور اپنے حق کے غصب ہوجانے کے بعد ائمہ اطہارؑ نے کیا رویہ اختیار کیا۔ دو نظریے پائے جاتے ہیں۔ ان دو نظریات کو ہم منفی اور مثبت نظریہ کا نام دیں گے۔

منفی نظریہ

منفی نظریہ کے حامی افراد کا خیال ہے کہ ائمہ علیہم السلام نے منصبِ خلافت سے محروم ہونے کے بعد اپنے اس حق کے حصول کے لیے کسی قسم کی جدوجہد نہیں کی بلکہ مسئلہ خلافت اور اجتماعی امور سے صرفِ نظر کرتے ہوئے فقط علوم اسلامی کی نشر و اشاعت اور اپنے ماننے والوں کی تعلیم و تربیت میں مشغول رہے۔
اپنے اس خیال کی تائید میں یہ حضرات مختلف و متنوع دلائل دیتے ہیں

اور ائمۂ اطہارؑ سے منسوب اقوال، تاریخی واقعات اور بعض احادیث سے استدلال بھی پیش کرتے ہیں۔

ذیل میں ہم اس سلسلہ میں پیش کیے جانے والے دلائل کا جائزہ لیتے ہیں:

منفی نظریہ کے دلائل

- ائمۂ اطہارؑ کون و مکان کے مالک تھے، ائمہؑ کائنات پر تصرف رکھتے تھے جس کے زیر اثر ایک لمحہ میں پوری کائنات کو تہ و بالا کر سکنے کی صلاحیت کے مالک تھے۔ اگر ائمہ مقام و منصبِ حکومت کی جانب مائل ہوتے تو کوئی طاقت نہ تھی جو انھیں اس کے حصول سے روک سکتی۔
- مندرجہ صدر قوت و طاقت اور کائنات پر اس قدر تصرف کے حامل ہوتے ہوئے حضرت علیؑ کی ۲۵ سالہ خاموشی اور گوشہ نشینی بھی اس بات کی دلیل ہے کہ آپؑ حکومت و قیادت سے کسی قسم کا کوئی سروکار نہیں رکھتے تھے۔
- خود جناب امیرؑ کے کلمات و خطبات گواہ ہیں کہ آپؑ حکومت و سلطنت کے لیے کسی معمولی سی حیثیت کے بھی قائل نہیں۔

مثلاً آپؑ فرماتے ہیں کہ:

تم اپنی دنیا کو میری نظروں میں بکری کی چھینک سے بھی زیادہ ناقابل اعتنا پاؤ گے۔"

(نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۳ کے آخری فقرات)

خلافت کے بارے میں آپؑ نے فرمایا:

"یہ ایک گدلا پانی اور ایسا لقمہ ہے جو کھانے والے کے گلے میں گلوگیر ہو کر رہے گا۔"

(نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۵)

بصرہ جاتے ہوئے مقام ذی قار میں امام علی علیہ السلام اپنا جوتا ٹانک رہے تھے کہ عبداللہ ابن عباس کو دیکھ کر فرمایا:

"اے ابن عباس اس جوتے کی کیا قیمت ہو گی؟"

ابن عباس نے عرض کی کہ:

"اب تو اس کی کچھ بھی قیمت نہ ہو گی۔"

تو آپؑ نے فرمایا کہ:

"اگر میرے پیش نظر حق کا قیام اور باطل کی نابودی نہ ہو تو تم لوگوں پر حکومت کرنے سے یہ جوتا مجھے کہیں زیادہ عزیز ہے۔"

(نہج البلاغہ۔ خطبہ نمبر ۳۳)

"خلیفہ سوم کے قتل کے بعد لوگ آپؑ کے پاس آئے اور کہا کہ آپؑ خلافت قبول کریں تو آپؑ نے جواب دیا کہ: مجھے ایسی خلافت کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ کسی اور کو دے دو۔"

(نہج البلاغہ ۹۲)

- امام حسن علیہ السلام نے معاویہ سے صلح کر کے اور خلافت سے کنارہ کش ہو کر اپنے شیعوں اور دوسروں کے خون کا تحفظ کیا اور ان کی تعلیم و تربیت کو ترجیح دینا اولیٰ سمجھا۔
- امام حسین علیہ السلام کی دس سالہ مدت امامت میں معاویہ کے ساتھ کسی قسم کی مزاحمت یا تصادم اختیار نہ کرنا اس بات

کی دلیل ہے کہ امام حسینؑ حکومت و قیادت سے کوئی دلچسپی نہ رکھتے تھے۔

امام حسین علیہ السلام کا یزید کے خلاف قیام بھی اس مقصد کے تحت نہیں تھا کہ وہ یزید کو خلافت سے ہٹانا چاہتے تھے۔ بلکہ چونکہ یزید نے ایک بچگانہ حرکت کرکے اس عظیم شخصیت سے بیعت کا مطالبہ کیا اس لیے امام حسینؑ کو تصادم کی راہ اختیار کرنا پڑی اور اگر یزید یہ غلطی نہ کرتا تو امام حسین علیہ السلام کبھی اس کے ساتھ تصادم مول نہ لیتے۔

ابو سلم خراسانی مے تین آدمیوں کے نام خط لکھ کر اپنے قاصد کے ذریعہ روانہ کیے۔ ایک خط امام صادق علیہ السلام، دوسرا نفسِ زکیہ اور تیسرا محمد اشرف کے نام تھا۔ ابو سلم نے اپنے قاصد کو ہدایت کی کہ اگر امام جعفر صادقؑ خط کے مضمون سے اتفاق کریں تو باقی دونوں خط جلا دینا اور اگر قبول نہ کریں تو ایک خط نفس زکیہ کو دینا۔

امام صادقؑ نے خط دیکھتے ہی اس کو آگ میں جلا دیا۔ مضمون خط میں خلافت کی پیشکش تھی کہ اگر آپؑ خلافت چاہتے ہیں تو ہم آپؑ کے ہاتھ پر بیعت کرکے خلافت کو ظالموں کے ہاتھوں سے چھین لیں گے۔"

(مروج الذہب جلد ۳ صفحہ ۲۵۴)

چنانچہ یہ بھی ایک دلیل ہے کہ ائمہ اطہارؑ خلافت کے خواہاں نہیں تھے ورنہ اس موقع پر امامؑ ان سے ضرور اتفاق کرتے۔

- مامون الرشید نے جب امام رضا علیہ السلام کو خلافت کی پیشکش کی تو آپؑ نے اس کو مسترد کردیا۔

(رحاب ائمہ جلد ۴ صفحہ ۱۱۹)

- ایک دلیل، ائمہؑ سے منسوب وہ روایت ہے جس میں ائمہؑ نے فرمایا کہ:

"ہر وہ جھنڈا جو قیام قائمؑ سے پہلے نکلے گا وہ طاغوت کا پرچم ہوگا۔"

- اپنے زمانے کی انقلابی تحریکوں پر ائمۂ اطہارؑ کی تنقید۔

منفی نظریے کا جواب

ائمۂ اطہار سلام اللہ علیہم اجمعین کے آمریت اور طاغوت کے خلاف قیام وجہاد نہ کرنے سے مراد اگر مسلح جہاد ہے تو یہ بات کچھ حد تک حقیقت سے مطابقت رکھتی ہے اگرچہ کلی طور پر اس بات کو بھی تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔

کیونکہ امیرالمومنین علیہ السلام کا پانچ سال تک مسلسل مصروف جنگ رہنا، امام حسنؑ کا معاویہ کے خلاف مسلح اقدام جس کے نتیجہ میں ان کا خلافت مسلمین سے دستبردار ہونا اور امام حسینؑ کا اسی ہدف کے لیے کوفے والوں سے بیعت لینا اس بات کی دلیل ہے۔

اگرچہ دیگر ائمہ اطہار علیہم السلام کا اس میدان میں قدم نہ اٹھانا بھی ایک حقیقت ہے۔

امیرالمومنین کا ۲۵ سال کے دوران عدم مزاحمت یا امام حسنؑ

کی صلح پر آمادگی اور دیگر ائمۂ اطہارؑ کے قیام نہ کرنے کی وجہ یہ نہ تھی کہ وہ اس کو صحیح نہیں سمجھتے تھے بلکہ اس کا سبب شرائطِ جہاد و مبارزہ کا فقدان تھا۔

- کسی بھی قیام کے لیے انصار و اعوان کا ہونا ایک ضروری اور اہم شرط ہے جو ناقابل انکار حقیقت ہے۔ خود ائمہ اطہار نے بھی اپنے عدم قیام اور خاموشی کی وجہ اسی شرط کو قرار دیا۔

- امیر المومنین علی ابن ابی طالبؑ نے اپنے سکوت و خاموشی کے اسباب و وجوہات بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ:

  "میں نے نگاہ اٹھا کر دیکھا تو مجھے اپنے اہلبیتؑ کے علاوہ کوئی معین و مددگار نظر نہ آیا۔ میں نے انھیں موت کے منہ میں دینے سے بخل کیا۔ آنکھوں میں خس و خاشاک تھا مگر میں نے چشم پوشی کی، حلق میں پھندے تھے مگر میں نے غم و غصہ کے گھونٹ پی لیے اور گلوگرفتگی کے باوجود حنظل سے زیادہ تلخ حالات پر صبر کیا۔"

- امام حسنؑ نے جب معاویہ سے ترکِ جہاد اور صلح کا معاہدہ کیا تو اپنے اصحاب سے گفتگو کرتے ہوئے آپؑ نے اس صلح کی جو توجیہ بیان کی اس کا لب لباب بھی باوفا انصار و اعوان کی کمی ہی تھا۔

مرد عقیدہ و جہاد، مجسمۂ ایمان، شہید راہ اسلام صحابئ بزرگ حضرت حجر بن عدی کندی نے جب امامؑ سے ان الفاظ میں اپنے غم و غصہ کا اظہار کیا کہ:

"ہمیں ذلت وخواری سے واپس ہونا پڑا لیکن وہ لوگ خوشی مناتے ہوئے واپس گئے۔"

تو امام حسنؑ ان کو گھر کے ایک گوشے میں لے گئے اور اپنی صلح کے فلسفہ سے ان الفاظ میں آگاہ فرمایا کہ:

"اے حجر میں نے تمھارے کلمات کو سنا لیکن ہر انسان وہ نہیں چاہتا جو تم چاہتے ہو نہ ان کی رائے ویسی ہے جیسی تمھاری رائے ہے۔ میں نے اس کام کو نہیں کیا مگر فقط تمھاری بقا کے لیے۔ ہمارا رب ہر آن نئی شان میں ہے۔"

(حیاتِ امام حسنؑ صفحہ ۲۶۵)

صحابیٔ بزرگ، مجسمۂ ایمان و فدا عدی ابن حاتم نے اس صلح سے برآمد ہونے والے ناگوار نتائج اور تلخیوں کو امام حسنؑ سے خطاب کرتے ہوئے ان الفاظ میں بیان کیا کہ:

"اے فرزندِ رسولؐ! مجھے یہ پسند تھا کہ آج یہ حالات دیکھنے سے پہلے میں مرجاتا۔ آج ہم عدل و انصاف سے نکل کر ظلم و جور کے منجدھار میں پھنس گئے ہیں۔ ہم نے اس حق کو چھوڑا جس میں ہم تھے اور باطل میں داخل ہوئے جس سے ہم فرار اختیار کیا کرتے تھے ہم نے خود اپنے ہاتھوں سے اپنے آپ کو ذلیل کیا۔"

(حیات امام حسن علیہ السلام صفحہ ۲۶۶)

عدی کے ان الفاظ سے امام حسن علیہ السلام کے سینے میں موجود غم وغصے میں اضافہ ہوا اور آپؑ نے اس غم وغصّے کے عالم میں اپنی حکمت عملی سے اپنے صحابی باوفا کو ان الفاظ میں آگاہ کیا کہ:

"اے عدی! لشکر میں سے اکثریت کی خواہش صلح کی تھی وہ جنگ کو جاری رکھنا پسند نہیں کرتے تھے لہٰذا میں نے نہیں چاہا کہ لشکر کو اس راہ کی طرف مجبور کروں جس کو وہ نہیں چاہ رہے تھے۔ میں نے یہ مصلحت سمجھی کہ اس جنگ کو کسی اور وقت کے لیے ملتوی کردوں کیونکہ ہمارا رب ہر دن نئی شان میں ہے۔"

جب عالم فاضل صحابی بزرگ حضرت ابو ذر غفاری کے دوست مالک بن ضمرار نے امام حسن علیہ السلام سے اس صلح پر ناراضگی کا اظہار کیا تو امامؑ نے ان الفاظ میں جواب دیا:

"مجھے خوف تھا کہ اگر اس جنگ کو جاری رکھتا تو مسلمان کرۂ ارض سے ختم ہوجاتے لہٰذا میں نے چاہا کہ اس دین کے لیے داعی باقی رہیں۔"

(حیات امام حسن علیہ السلام جلد دوم صفحہ ۲۶۹ نقل از بحارالانوار)

 امام حسین علیہ السلام نے بھی اپنے اعوان وانصار کی کمی پر لشکر اموی سے خطاب کرتے ہوئے اپنے حزن وملال کا اظہار

یوں فرمایا :

" میں اس دشمن کی طرف انصار و مددگار کی قلّت
کے ساتھ جا رہا ہوں۔"

(امام حسینؑ کا لشکر سعد سے خطاب۔ عیون العبریٰ صفحہ ۱۰)

○ —— امام سجادؑ صحیفۂ کاملہ میں فرماتے ہیں :

" خداوندا میں نے اپنے ضعف و ناتوانی کی طرف دیکھا
کہ میں مشکلات کو برداشت نہیں کرسکتا اور اپنے
دشمن پر جو میرے خلاف ہے اس سے جنگ کرنے
میں فتح کی امید نہیں رکھتا۔ میرے دشمن کی تعداد زیادہ
ہے اور میں اکیلا ہوں۔"

(ائمہ اثنا عشری۔ صفحہ ۱۴۳)

ابوعمرو جہدی نے امام سجادؑ سے نقل کیا ہے کہ آپؑ نے فرمایا کہ :

" مکہ اور مدینہ میں بیس آدمی بھی صحیح معنوں میں
ہم سے محبّت کرنے والے نہیں۔"

○ —— سدیر صیرفی کہتا ہے کہ میں امام صادقؑ کی خدمت میں حاضر
ہوا اور عرض کی :

" مولا! واللہ آپؑ کا قعود (عدم قیام) صحیح نہیں ہے۔"

امامؑ نے فرمایا :

" اے سدیر کیوں ——————— ؟"

میں نے عرض کیا کہ :

" آپ کے شیعہ و موالی اور انصار و اعوان کثیر تعداد

میں موجود ہیں۔"

امام علیہ السلام نے فرمایا:

"تیرے خیال میں کتنے ہوں گے ——— ؟"

میں نے کہا کہ:

"ایک لاکھ ——— !"

اس پر امامؑ نے تعجب کیا تو میں نے کہا:

"دو لاکھ ——— !"

امامؑ نے پھر بھی تعجب کیا تو میں نے کہا:

"آدھی دنیا ——— !"

پھر امام خاموش رہے اور مجھ سے بات نہیں کی اور باہر نکل گئے۔ میں بھی امامؑ کے ساتھ تھا کہ گوسفند کا ایک گلّہ وہاں نظر آیا۔ امام علیہ السلام نے فرمایا کہ:

"اگر اس گلّہ کی تعداد کے برابر بھی میرے پاس انصار ہوتے تو میرے لیے بیٹھنا صحیح نہیں تھا۔"

(ائمہ اثنا عشری صفحہ نمبر ۱۶۷

اصول کافی جلد دوم صفحہ ۲۴۲)

سدیر کہتے ہیں کہ جب ہم نے گلّہ میں گوسفندوں کو شمار کیا تو ان کی تعداد سترہ تھی۔

(بحار الانوار جلد ۷۶ صفحہ ۱۶۱)

○ ——— جب مامون الرشید نے امام رضا علیہ السلام کو خراسان میں بلایا اور آپ کو خلافت کی پیش کش کی تو امامؑ نے معذرت کے

ساتھ اس پیشکش کو مسترد کر دیا۔ مامون نے مجلس میں موجود افراد سے خلوت اختیار کی اور حضرت امام رضا علیہ السلام اور مامون کے علاوہ تیسرا شخص فضل ابن سہل ذوالریاستین موجود رہا تو مامون نے پھر اس بات کو تاکید سے دہرایا اور کہا کہ:

"میں اس امر کو آپؑ کے ذمہ کرنا چاہتا ہوں اور خود سبک دوش ہونا چاہتا ہوں۔"

امام علیہ السلام نے کہا:

"خدا کے لیے نہیں، مجھے اس کے تحمل کی طاقت و قدرت نہیں۔"

(درحاب ائمہ جلد چہارم صفحہ ۱۱۹)

امامؑ کے اس جملے "مجھے اس کے تحمل کی طاقت و قدرت نہیں" کا مفہوم یہ نہیں تھا کہ خدانخواستہ امامؑ خود اہلیت و صلاحیت نہیں رکھتے تھے بلکہ امام علیہ السلام کی مراد یہ تھی کہ ان کے پاس ایسے قابل اعتماد اور باوفا اعوان و انصار کی کمی تھی کہ جو حکومت ملنے کے بعد مملکت کے امور کو سنبھال سکیں۔ جبکہ یہ بات بھی امامؑ خوب سمجھتے تھے کہ مامون کی طرف سے خلافت کی پیشکش خلوص نیت پر مبنی نہیں تھی۔ اور امامؑ کو اس کی سازشوں کا بھی مقابلہ کرنا تھا۔

ان تمام اقوال، کلمات اور سیرت ائمہ طاہرینؑ سے یہ بات واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ طاغوت اور آمریت کے خلاف مسلح قیام کے لیے طاقت و قدرت کا موجود ہونا ایک شرطِ لازم ہے۔ طاقت و قدرت سے مراد فقط افراد کی کثرت نہیں۔ اگرچہ افرادی قوت کی

اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن اعوان و انصار کی کثرت کے ساتھ ساتھ اہلیت و صلاحیت کے حامل اور عقل و شعور رکھنے والے افراد کا میسر ہونا بھی از حد ضروری ہے۔

اعوان و انصار اور مجاہدین کی افرادی قوت کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔

ایک عوام الناس جو غیر تربیت یافتہ اور غیر منظم افراد پر مشتمل ہوتے ہیں؛

اور دوسرے تربیت یافتہ عقل و شعور کے حامل باصلاحیت افراد اور منظم مجاہدین۔ جیسا کہ امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں کہ:

"دیکھو! تین قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک عالم ربانی،
دوسرے متعلم جو کہ نجات کی راہ پر برقرار رہے
اور تیسرے عوام الناس کا وہ پست گروہ کہ جو ہر پکارنے
والے کے پیچھے ہو لیتا ہے اور ہر ہوا کے رخ پر مڑ جاتا ہے نہ
انھوں نے حوضِ علم سے کسبِ ضیا کیا نہ کسی مضبوط
سہارے کی پناہ لی۔"

(نہج البلاغہ کلمات قصار ۱۴۷)

انصار و اعوان کی انہی اقسام کی جانب سدیر صیرفی اور امام صادقؑ والی روایت بھی روشنی ڈالتی ہے، چنانچہ سدیر صیرفی جب آپؑ کے شیعہ اور اعوان و انصار کی تعداد ایک لاکھ بتاتا ہے تو امامؑ حیرت فرماتے ہیں۔

آپؑ کی حیرت پر سدیر پھر کہتا ہے کہ ایک لاکھ نہیں، دو لاکھ، نہیں بلکہ آدھی دنیا۔ تو کیا سدیر نے جھوٹ بولا تھا اور غلط بیانی کی تھی؟

یا سدیر نے تعداد بتانے میں غیر معمولی مبالغہ سے کام لیا تھا؟

اگر مبالغہ سے کام لیا تو امامؑ کے حیرت و تعجب کرنے پر اصولاً اسے اپنی مبالغہ آرائی کی اصلاح کرتے ہوئے امامؑ کے حامی اور ناصران کی تعداد کم کر کے بتانا

چاہیئے تھا لیکن اس کے برخلاف وہ تعداد اور زیادہ بتاتا ہے حتّٰی کہ دو لاکھ اور پھر آدھی دنیا ــــ!

ادھر امام علیہ السلام سدیر سے فرماتے ہیں کہ اگر میرے پاس سترہ افراد بھی ہوتے تو میرا عدمِ قیام صحیح نہ تھا ــــــــ؛

سدیر صیرفی جیسے صحابیٔ امامؑ سے کیا جھوٹ اور غلط بیانی کی توقع کی جاسکتی ہے؟

اور اگر سدیر کے بیان کو بالفرض محال مبالغہ آرائی پر محمول کیا جائے تو امامؑ کی بتائی ہوئی سترہ افراد کی تعداد اور سدیر کی بیان کردہ تعداد میں یہ حیرت انگیز فرق کیوں؟

یا پھر کیا امامؑ اپنے شیعوں، موالی اور اعوان و انصار کے خلاف خدانخواستہ سوءِ ظن رکھتے تھے ــــــــ؟

نہیں، ایسا نہیں ہے!

حقیقت یہ ہے کہ نہ تو سدیر صیرفی نے غلط بیانی کی اور نہ امامؑ اپنے شیعوں سے کوئی بدگمانی رکھتے تھے۔ بلکہ امامؑ کی نظریں عقل و شعور کے حامل ایسے افراد کی تلاش میں تھیں جو امورِ خلافت اور مملکت کو سنبھالنے میں صحیح معنوں میں امامؑ کے یاور و مددگار ثابت ہوسکیں۔

یہی وجہ ہے کہ جب کوفہ سے امام حسین علیہ السلام کو بارہ ہزار خطوط ملتے ہیں کہ اہلِ کوفہ آپؑ کی بیعت کے لیے تیار ہیں تو امام علیہ السلام خود کوفہ کا رُخ نہیں کرتے حالانکہ خطوط کی یہ تعداد بتاتی ہے کہ اہلِ کوفہ کی ایک کثیر تعداد ہے جو امامؑ کی بیعت کرنے کے لیے امامؑ کے انتظار میں ہے۔ لیکن امامؑ خود نہیں جاتے بلکہ اپنے سفیر مسلم بن عقیل کو روانہ کرتے ہیں کہ وہ مشاہدہ کریں اور جائزہ لیں کہ بیعت

کے لیے امامؑ کے منتظر افراد میں ان افراد کی تعداد کتنی ہے جو صاحبِ عقل، ذی شعور اور بالغ نظری کے حامل ہیں۔

چنانچہ امام علیہ السلام نے حضرت مسلم کے ذریعہ جو خط روانہ کیا اس کا مضمون کچھ یوں ہے:

"میں نے تمھارے خطوط کو پڑھا اور تمھارے مقاصد و اہداف سے آگاہ ہوا۔ تم نے مجھے لکھا کہ ہمارا کوئی قائد اور رہبر نہیں، خدا آپ کے توسط سے ہمیں حق و ہدایت پر گامزن کرے۔

میں اپنے بھائی مسلم بن عقیل کو تمھاری طرف بھیج رہا ہوں۔ میں نے انھیں حکم دیا ہے کہ وہ مجھے تمھارے حالات اور تمھاری رائے کے بارے میں خط لکھیں اگر وہ کہیں گے کہ تمھارے اہلِ فضل اور عقل و شعور رکھنے والے ان خطوط کے مضامین سے اتفاق کرتے ہیں تو میں جلد ہی تمھارے پاس پہنچوں گا۔"

مثبت نظریہ

منفی نظریہ کے برخلاف مثبت نظریہ' یہ ہے کہ ائمہ طاہرینؑ نے ایک لمحہ کے لیے بھی اس بات کو گوارہ نہ کیا کہ مسلمانوں کے اوپر کوئی نااہل حاکم حکومت کرے۔ ائمہ طاہرینؑ نے اپنے حق حکومت کے حصول اور مسندِ اقتدار کی بازیابی کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ کیونکہ ایسا کرنا نہ صرف عقل و شرع کے نقطۂ نظر

سے بلکہ ائمۂ اطہارؑ کے ارشادات کے مطابق ایک مستحسن فعل ہی نہیں بلکہ اوجب واجبات میں سے ہے اور اس کے عقلی اور نقلی دلائل موجود ہیں۔

مثبت نظریہ کے دلائل

○ —— دنیا بھر کے عقلا کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ ظلم و ستم کے خلاف انسان کو جدوجہد اور قیام کرنا چاہیے۔ خواہ یہ ظلم اس کی ذات پر کیا جا رہا ہو یا پورا معاشرہ اس کا شکار ہو۔

اس عقلی دلیل کی تائید قرآن کریم اور روایاتِ معصومینؑ سے بھی ہوتی ہے۔

" وہ لوگ جو اپنے نفس پر ظلم کرتے تھے ملائکہ نے ان کی روح قبض کی اور ان سے کہا کہ تم کس حالت میں تھے تو انھوں نے جواب دیا کہ ہم زمین میں مستضعف اور کمزور تھے تو جواب ملا کہ کیا خدا کی زمین وسیع اور عریض نہیں تھی کہ تم وہاں ہجرت کرتے۔ ان لوگوں کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ انتہائی بُرا ٹھکانا ہے۔"

(سورۂ نساء۔ آیت ۹۷)

حضرت امیر علیہ السلام نے اپنے وصیت نامہ میں امام حسنؑ اور امام حسین علیہ السلام سے فرمایا کہ:

" تم مظلوم کا ساتھ دو اور ظالم سے دشمنی رکھو۔"

(نہج البلاغہ۔ خطبہ ۴۷)

خطبۂ شقشقیہ کے آخری حصہ میں امیرالمومنینؑ فرماتے ہیں کہ:

"خداوند عالم نے علماء سے عہد و پیمان لیا ہے کہ وہ مظلوم کی گرسنگی اور ظالم کی شکم پُری پر صبر نہ کریں۔"

(نہج البلاغہ خطبہ ۳)

حضرت امیرؑ فرماتے ہیں کہ:

"دبا ہوا میری نظروں میں طاقتور ہے جب تک کہ میں اس کا حق دلوا نہ دوں اور طاقتور میرے نزدیک کمزور ہے جب تک کہ میں اس سے دوسروں کا حق نہ دلوا دوں۔"

(نہج البلاغہ خطبہ ۳۷)

اس کے علاوہ اور بھی کافی روایات اس کے بارے میں موجود ہیں جو ظلم کے خلاف جہاد کرنے اور مظلوم کا دفاع کرنے کی دعوت دیتی ہیں۔

○ بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ حق امامت و خلافت ائمۂ اطہارؑ کا ذاتی حق ہے اور امت کے لیے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ یہ خلافت و امامت جو ان کا ذاتی حق ہے انھیں ملے یا نہ ملے۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ جیسا کہ عفو و درگزر، جود و سخا ائمہؑ کا شیوہ رہا ہے انھوں نے خلافت و ولایت کے بارے میں بھی عفو و درگزر سے کام لے کر اپنی وسعت نظری اور فراخدلی کا ثبوت دیا ہے۔ یہ خیال اور نظریہ درست

نہیں، اس لیے کہ خلافت و ولایت بالخصوص ملتِ اسلامیہ اور بالعموم پوری انسانیت کی تقدیر و سعادت یا شقاوت سے مربوط ہے۔ اگر خلافت اس کے حقدار یعنی ائمہ معصومین ؑ کو حاصل نہ ہو سکے تو یہ پوری ملت پر ظلم ہوگا۔

اس موقف کی دلیل امام حسن ؑ کے صحابی عدی بن حاتم کے وہ الفاظ بھی ہیں جو ہم نے منفی نظریہ کے ذیل میں گزشتہ صفحات پر نقل کیے ہیں۔ جس میں عدی بن حاتمؓ صلحِ امام حسن ؑ پر اعتراض کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

"اے فرزندِ رسول ؐ! مجھے یہ پسند تھا کہ آج یہ حالات دیکھنے سے پہلے مرجاتا۔ آج ہم عدل و انصاف سے نکل کر ظلم و جور کے منجدھار میں پھنس گئے ہیں۔ ہم نے اس حق کو چھوڑا جس میں ہم تھے اور باطل میں داخل ہوئے جس سے ہم فرار اختیار کیا کرتے تھے ہم نے خود اپنے ہاتھوں سے اپنے آپ کو ذلیل کیا۔"

اسی طرح خلیفہ دوم نے اپنے بعد خلافت کے لیے چھ رکنی شوریٰ قائم کی اور تیسری خلافت کے لیے نامزد افراد سے گفتگو کی۔ جب اس گفتگو کا رُخ حضرت علی علیہ السلام تک پہنچا تو حضرت عمر نے علی علیہ السلام کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ:

"اے علی ؑ! خدا کی قسم اگر آپ کی طبیعت اور مزاج میں مزاح اور تمسخر کا عنصر نہ ہوتا اور ان لوگوں پر آپ ؑ کو حکومت ملتی تو آپ ؑ ان کو سیدھے راستے پر اور حق و

حقیقت کی طرف گامزن کرتے ۔"

(حیات امام حسن علیہ السلام ۔ باقر قرشی جلد اوّل صفحہ ۱۸۳)

یعنی حضرت عمرؓ یا حضرت علیؑ کے دیگر مخالفین کے بقول اگر حضرت علیؑ کے مزاج میں تمسخر اور مزاح کی عادت نہ ہوتی تو فقط علیؑ ہی اس کے اہل تھے کہ خلافت ان کو ملتی اور ملت کی سعادت کا سبب بنتی ۔

بہرحال یہ بات واضح ہے کہ خلافت و ولایت وہ مسئلہ ہے جس سے پوری امتِ مسلمہ کی تقدیر وابستہ ہوتی ہے اور اس پر عفو و درگزر سے کام لینا غلط ہے ۔ لہٰذا یہ فکر کہ ائمہ اطہارؑ نے اس مسئلہ پر عفو و درگزر سے کام لیا صحیح نہیں ہے ۔

حضرت امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں کہ :

" خلافت ہمارا حق ہے اگر ہمیں دیا گیا تو ہم لے لیں گے ورنہ ہم اونٹ کے پٹھوں پر سوار ہوں گے اگرچہ شب روی طویل ہو ۔"

یعنی حضرت فرماتے ہیں کہ اگر خلافت ہمیں مل جائے تو ہم اسے لے لیں گے کہ وہ ہمارا حق ہے اور ہم ہی اس کے اہل ہیں ورنہ اس کی جستجو میں ہم ذلیل و خوار ہونا بھی قبول کر لیں گے ۔

حضرت امیر علیہ السلام فرماتے ہیں کہ :

" میں نے اس امر (یعنی معاویہ سے خلافت کے سلسلے میں جنگ کرنے یا نہ کرنے) کو اچھی طرح پرکھ لیا ہے اور اندر اور باہر سے دیکھ لیا ہے ۔ مجھے تو جنگ کے علاوہ کوئی چارہ نظر نہیں آتا سوائے اس کے کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو (دین) لے کر آئے اس سے

(معاذاللہ) کفر اختیار کیا جائے۔"

(نہج البلاغہ خطبہ ۴۳)

یہ کلمات جناب امیرؑ نے اس موقع پر ارشاد فرمائے جبکہ آپ نے امیر معاویہ کے خلاف جنگ کا ارادہ کیا کیونکہ امیر معاویہ نے آپؑ کی سلطنت کے ایک صوبہ (شام) میں مسندِ اقتدار پر قبضہ جما رکھا تھا۔

جنابِ امیرؑ کے اس رویہ ہی سے اس بات کا صراحتاً اظہار ہوتا ہے کہ آپؑ نااہل قیادت سے اقتدار کی بازیابی اور مسلمانوں کو ظلم و ستم سے نجات دلانے کے معاملہ میں کس طرح کے خیالات رکھتے تھے اور ایک لمحہ کے لیے بھی اس بات کے روادار نہ تھے کہ خواہ ایک صوبہ ہی پر سہی، کوئی نااہل حاکم مسلط ہو۔ چہ جائے کہ پوری مملکتِ اسلامی پر ایسے لوگوں کا قبضہ ہو۔

جب لوگوں نے حضرت عثمان کی بیعت کا ارادہ کیا تو حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا کہ:

"تم جانتے ہو کہ مجھے اوروں سے زیادہ خلافت کا حق پہنچتا ہے۔"

(نہج البلاغہ۔ خطبہ ۷۲)

جب طلحہ اور زبیر نے نقضِ بیعت کی اور حضرت علی علیہ السلام کے خلاف لشکر کشی کی تو حضرت نے فرمایا:

" اگر ان لوگوں نے اطاعت سے انکار کیا تو میں تلوار کی باڑھ ان کے سامنے رکھ دوں گا جو باطل سے شفا دینے اور حق کی نصرت کے لیے کافی ہے۔"

(نہج البلاغہ۔ خطبہ ۲۲)

حضرت امیر علیہ السلام فرماتے ہیں:

" مجھے اپنی زندگی کی قسم! میں حق کے خلاف چلنے والوں اور گمراہی میں بھٹکنے والوں سے جنگ میں کسی قسم کی رو رعایت اور سستی نہیں کروں گا۔ اللہ کے بندو! اللہ سے ڈرو اور اس کے غضب سے بھاگ کر اس کے دامنِ رحمت میں پناہ لو، اللہ کی دکھائی ہوئی راہ پر چلو اور اس کے عائد کردہ احکام کو بجا لاؤ (اگر ایسا ہو تو) علیؑ تمھاری نجاتِ اُخروی کا ضامن ہے اگرچہ دنیوی کامرانی تمھیں حاصل نہ ہو۔"

(نہج البلاغہ خطبہ ۲۴)

بصرہ جاتے ہوئے مقامِ ذی قار پر حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ:

" میں باطل کو چیر کر حق کو اس کے پہلو سے نکال لوں گا مجھے قریش سے اس (نزاعِ خلافت) کے سوا اور وجہ نزاع ہے ہی کیا؟ خدا کی قسم! میں نے ان سے جنگ کی جبکہ وہ کافر تھے اور اب بھی جنگ کروں گا جبکہ وہ باطل کے ورغلانے میں آچکے ہیں اور جس شان سے کل میں ان کے مدمقابل رہ چکا ہوں ویسا ہی آج ثابت ہوں گا۔"

(نہج البلاغہ۔ خطبہ ۳۳)

ان تمام خطبات وارشادات میں حضرتؑ بار بار اعلان فرما رہے ہیں کہ ان کا اپنے مخالفین سے جنگ وجہاد کا واحد مقصد حق کو غلبہ دلانا اور حق کو بلند کرنا ہے۔

جس کے بارے میں وہ کسی قسم کی سستی اور کوتاہی نہ کرنے کا اعلان کر رہے ہیں۔
غور و فکر کا مقام ہے۔

کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت اپنے ذاتی حق کی بات کر رہے ہیں یا مخصوص افراد کے حق کی گفتگو فرما رہے ہیں ؟

کیا یہ تمام گفتگو ملتِ اسلامیہ کے حقوق کے بارے میں نہیں ؟
ان تمام ارشادات کی روشنی میں خلافت و ولایت کے موضوع کے علاوہ کیا کوئی اور چیز مصداقِ موضوع قرار دی جا سکتی ہے۔؟

کسی نے جب یہ کہا کہ اے ابن ابی طالبؑ ! آپ تو خلافت پر للچائے ہوئے ہیں تو آپؑ نے فرمایا کہ :

"خدا کی قسم ! تم اس پر کہیں زیادہ حریص اور (اس منصب کی اہلیت سے زیادہ) دور ہو اور میں اس کا اہل اور اس سے زیادہ نزدیک ہوں۔ میں نے تو اپنا حق طلب کیا ہے اور تم میرے اور میرے حق کے درمیان حائل ہو جاتے ہو۔ اور جب اسے حاصل کرنا چاہتا ہوں تو تم میرا رخ موڑ دیتے ہو۔"

(نہج البلاغہ۔ خطبہ ۱۷۰)

حضرت کے ان کلمات سے واضح ہے کہ آپؑ نے خلافت کے لیے اس حد تک جدوجہد کی کہ آپؑ کے مخالفین نے آپؑ پر حریص اور لالچی ہونے کی تہمت لگائی۔ چنانچہ جواب میں حضرت نے فرمایا کہ خلافت سے نزدیک تر اور اس منصب کی سب سے زیادہ اہل خود حضرت کی ذات ہے۔

آپؑ نے مزید فرمایا کہ جو بھی حضرت اور حضرت کے حق کے درمیان ہو حقیقتاً

وہ حریص اور لالچی کہلائے جانے کا زیادہ مستحق ہے اور وہ باطل دعویٰ کرتا ہے۔

امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں کہ:

" اے لوگو! اس خلافت کا اہل وہ ہے جو اس کی سب سے زیادہ قوت رکھتا ہو اور اس کے بارے میں اللہ کے احکام کو سب سے زیادہ جانتا ہو۔ اس صورت میں اگر کوئی فتنہ پرداز فتنہ کھڑا کرے تو (پہلے) اسے توبہ و بازگشت کے لیے کہا جائے گا۔ اپنی جان کی قسم! اگر خلافت کا انعقاد تمام افراد امت کے ایک جگہ اکٹھا ہونے سے ہو تو اس کی کوئی سبیل نہیں بلکہ (اس کی) صورت تو انھوں نے یہ رکھی تھی کہ اس کے کرتا دھرتا لوگ اپنے فیصلے کا ان لوگوں کو بھی پابند بنائیں گے جو بیعت کے وقت موجود نہ ہوں۔ پھر جو لوگ موجود ہیں ان کو یہ حق نہ ہوگا کہ وہ (بیعت سے) انحراف کریں اور نہ ہی غیر موجود لوگوں کو یہ حق ہوگا کہ وہ کسی اور کو منتخب کریں۔

دیکھو! میں دو شخصوں سے ضرور جنگ کروں گا۔ ایک وہ جو ایسی چیز کا دعویٰ کرے جس کا وہ اہل نہ ہو اور دوسرا وہ جو اپنے معاہدہ کا پابند نہ رہے۔"

(نہج البلاغہ خطبہ ۱۷۱)

قارئین گرامی مندرجہ صدر سطور میں ہم نے اس سلسلہ میں بحث کی کہ ائمہ معصومینؑ

نے انسانیت کو ظلم و ستم کے چنگل سے نجات دلانے اور اپنے حقِ حکومت کی بازیابی کے سلسلہ میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا اور اس سلسلہ میں پیہم جدوجہد میں مشغول رہے۔ اب ہم ائمہ طاہرینؑ کے اس طریقۂ کار اور لائحۂ عمل کو بیان کریں گے جو اس سلسلہ میں آپ علیہم السلام نے اختیار کیا۔

ائمۂ طاہرینؑ کا لائحۂ عمل

اپنے غصب شدہ حق کی بازیابی، معاشرہ میں اسلامی تعلیمات کے رواج، اور حکومتِ اسلامی کے قیام کے سلسلہ میں ائمۂ طاہرین علیہم السلام نے درج ذیل لائحۂ عمل کے تحت اقدامات کیے۔

(۱) ——— دینِ اسلام، امتِ محمدیؐ اور حکام کو انحرافات کی دلدل میں پھنسنے سے بچایا۔

(۲) ——— عامۃ المسلمین کو دین کی حقیقی رُوح سے آشنا کرنے کے لیے، اسلامی افکار کی تشریح و تبلیغ۔

(۳) ——— بالواسطہ جہاد کا اہتمام و تائید۔

آئندہ صفحات میں ہم ان تین نکات پر علیحدہ علیحدہ روشنی ڈالیں گے۔

(۱) انحرافات سے بچاؤ

اس سلسلہ میں ائمۂ اطہار نے جو اقدامات کیے ان میں پہلا اقدام اسلام اور مسلمانوں اور مسلم حکام کو مزید انحرافات سے بچانے کی سعی کی تھی، جس کی اجمالاً تفصیل یہ ہے۔

شریعت اسلامی کو انحرافات سے بچانا

ا ــــــ دینِ اسلام میں قرآن وسنت کے خلاف نئے احکامات کو داخل ہونے سے روکنے کی سعی وکوشش، جیساکہ امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام پہلی تین خلافتوں کے دور میں کرتے رہے اور قرآن وسنت کے خلاف صادر ہونے والے احکامات کی نشاندہی اور اصلاح فرماتے رہے جس کے اعتراف میں خلیفۂ دوم فرماتے ہیں کہ:

"خدا مجھے اس دن کے لیے زندہ نہ رکھے جس دن علی ابن ابی طالبؑ موجود نہ ہوں۔"

محافظِ شریعت ابوطالبؑ کے فرزند، امام علیؑ کی نظریں ہر آن اس امر پر رہیں کہ کوئی چیز خلاف قرآن وسنت شریعت میں داخل نہ ہونے پائے۔

ب ــــــ شریعتِ اسلامی کو متزلزل کرنے اور اس میں غیر اسلامی عقائد و افکار کی آمیزش کے سلسلہ میں دو اطراف سے کوششیں کی جا رہی تھیں۔ ایک طرف تو خود حکام مسلمین خصوصاً بنی عباس کے خلفاء حکومتی سطح پر ایسے علماء کی حوصلہ افزائی کرتے تھے جن کا دینِ اسلام سے کوئی واسطہ نہ تھا اور جو یونانی فلسفہ اور الحادی فکر کے حامل تھے۔ ایسے علما کے ذریعہ درباری سطح پر مناظرے کرائے جاتے جس کے ذریعہ ان کے افکار و نظریات کے مسلم معاشرے میں ترویج وتبلیغ کے دروازے کھلتے۔

اور دوسری جانب دینِ اسلام کو متزلزل کرنے کے سلسلہ میں اس کے روایتی حریف یہود و نصاریٰ سرگرم عمل تھے ۔

ایسے حالات میں صرف اہلبیت اطہارؑ کی ہستیاں ہی تھیں جو ان حملوں کی راہ میں ایک سدِ محکم بنی ہوئی تھیں جس کے چند شواہد و مثالیں ذیل میں پیش خدمت ہیں۔

(۱) ——— ابن ابی العوجار، حسن بصری کا شاگرد تھا۔ یہ شخص بعد میں گمراہ اور توحید کا منکر ہو گیا ۔ اس کی گمراہی اس حد تک بڑھی کہ اس نے امام صادق علیہ السلام پر اعتراض کیا کہ :

"آپؑ کب تک اس گھر (یعنی خانہ کعبہ) کے چکر لگاتے رہیں گے اور اس پتھر کو بوسے دیتے رہیں گے اور کب تک اس اینٹ اور گارے کے بنے ہوئے گھر کی عبادت کرتے رہیں گے"!

آگے چل کر یہ شخص پھر امام پر اعتراض کرتے ہوئے سوال کرتا ہے کہ :

"آپؑ کا وہ خدا جسے آپ کہتے ہیں کہ وہ ہر جگہ موجود ہے، کہاں ہے ؟ یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ ہر جگہ موجود ہے ؟ اگر وہ زمین پر ہے تو پھر آسمان پر کیسے ہے ؟ اگر آسمان پر ہے تو پھر زمین پر کیونکر ہے ۔؟"

امامؑ نے جواب میں فرمایا کہ :

"تو نے خدا کا قیاس مخلوقات پر کیا ہے یہ تو جسم و جسمانیات رکھنے والی مخلوق کا خاصہ ہے

کہ وہ اگر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو تو پہلی
جگہ اس سے خالی اور دوسری جگہ اس سے پُر ہو
جاتی ہے لیکن خدا کی ذات سے نہ کوئی جگہ خالی ہے
اور نہ ہی وہ کون و مکان میں مقید ہے۔"

(احتجاج طبرسی جلد دوم صفحہ ۲۳۵/۲۳۶)

(۲) ——— جاثلیق ان علماءِ نصاریٰ میں سے تھا جن کو مامون الرشید خلیفۂ بنی عباس نے اس مقصد کے تحت بلوایا تھا کہ وہ مسلمانوں کے عقائد اور نظریات کو متزلزل کریں۔ اس نے امام رضا علیہ السلام سے کہا کہ:

"آپ حضرت عیسیٰؑ کی نبوّت اور ان کی کتاب کے بارے میں کیا عقیدہ رکھتے ہیں؟ آیا ان دونوں میں سے کسی کا انکار کرتے ہیں؟"

امام علیہ السلام نے جواب دیا کہ:

"میں اس عیسیٰؑ اور ان کی کتاب پر تو ایمان رکھتا ہوں جو محمدؐ اور ان کی کتاب کی بشارت دیتا ہے اور جس کے حواری اس کی تصدیق کرتے ہیں لیکن ہر اس عیسیٰ کا انکار کرتا ہوں جو محمدؐ اور ان کی کتاب کا اقرار نہیں کرتا اور اپنی امت کو ان کی بشارت نہیں دیتا۔"

امامؑ آگے چل کر پھر فرماتے ہیں کہ:

"اے نصرانی خدا کی قسم! ہم اس عیسیٰؑ پر ایمان

رکھتے ہیں جو محمدؐ پر ایمان لائے۔ ہمیں حضرت عیسیٰؑ
پر کوئی اعتراض نہیں سوائے اس کے کہ وہ نماز
کم پڑھتے تھے اور روزے کم رکھتے تھے اور یہ کہ
وہ کمزور اور ناتوان تھے۔"

امامؑ کے ان کلمات پر جاثلیق مشتعل ہوگیا اور کہنے لگا کہ:

"خدا کی قسم! میں تو آپؑ کو اسلام کا سب سے
بڑا عالم سمجھتا تھا لیکن یہ کہہ کر تو آپؑ نے اپنی
نادانی کا ثبوت دیا۔"

جاثلیق نے کہا کہ:

"حضرت عیسیٰؑ نے تو ایک دن بھی روزہ ترک
نہیں کیا اور کوئی رات انھوں نے سو کر نہیں گزاری
وہ تو ہمیشہ صائم الدہر اور قائم اللیل تھے۔"

اس پر امامؑ نے نصرانی سے دریافت کیا کہ:

"حضرت عیسیٰؑ یہ نماز اور روزہ کس کے لیے
انجام دیتے تھے؟"

امامؑ کے اس سوال نے جاثلیق کو مبہوت کر دیا۔ ظاہر ہے
کہ جاثلیق مجبور تھا کہ وہ یہ جواب دے کہ حضرت عیسیٰؑ کی نماز
اور روزہ خدا کے لیے تھا۔ لیکن اس جواب سے خود نصرانی
کے عقیدے کا بطلان ہوتا تھا۔

(احتجاج طبرسی جلد دوم صفحہ ۱۷۴)

(۳) —— امامؑ کے شاگرد ہشام بن حکم سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ

حج کے موقع پر ابن ابی العوجاء، ابو شاکر دیصانی (زندیق) عبدالملک بصری اور ابن مقفع، خانہ کعبہ کے نزدیک جمع تھے۔ یہ حاجیوں کا مذاق اڑا رہے تھے اور قرآن پر طعن و تشنیع کر رہے تھے۔ ابن ابی العوجاء نے تجویز پیش کی کہ ان میں سے ہر ایک قرآن کے چوتھائی حصہ کو باطل ثابت (کرنے کی سعی) کرے اور آئندہ سال وہ سب پھر اسی موقع پر اسی غرض سے جمع ہو کر اس کام کو اختتام تک پہنچائیں۔ اس نے کہا کہ:

"اگر ہم اس میں کامیاب ہو گئے تو گویا ہم نے پورے قرآن کو باطل ثابت کر دیا جس کے نتیجہ میں نہ صرف محمدؐ کی نبوت باطل ثابت ہو جائے گی بلکہ گویا پورا اسلام ہی باطل ثابت ہو جائے گا۔"

اس بات پر متفق ہونے کے بعد آئندہ سال وہ پھر اسی جگہ جمع ہوئے تو ابن ابی العوجاء نے کہا کہ:

"تم لوگوں سے جدا ہونے کے بعد میں آیت:

"فَلَمَّا اسْتَيْأَسُوا مِنْهُ خَلَصُوا نَجِيًّا"

(سورہ یوسف آیت ۸۰)

پر ہی غور کرتا رہا لیکن اس آیت کی فصاحت اور بلاغت کے مقابلہ میں کوئی اس جیسی عبارت بنانے سے عاجز اور قاصر رہا۔"

اسی طرح عبدالملک نے آیت:

"يَاأَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوا لَهُ إِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِن دُونِ اللهِ لَن يَخْلُقُوا ذُبَابًا وَلَوِ اجْتَمَعُوا لَهُ وَإِن يَسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْئًا لَّا يَسْتَنقِذُوهُ مِنْهُ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوبُ" (سورہ حج آیت ۷۳) کے بارے میں۔ ابوشاکر نے آیت:

"لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللهُ لَفَسَدَتَا"

کے بارے میں اور ابن مقفع نے آیت:

"وَقِيلَ يَا أَرْضُ ابْلَعِي مَاءَكِ وَيَا سَمَاءُ أَقْلِعِي وَغِيضَ الْمَاءُ وَقُضِيَ الْأَمْرُ وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُودِيِّ وَقِيلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظَّالِمِينَ" (سورہ ہود آیت ۴۴)

کے بارے میں یہ اعتراف کرتے ہوئے کہ یہ قرآن بشر کا کلام نہیں ہے اسی عجز کا اظہار کیا۔ ہشام کہتے ہیں کہ ابھی یہ گفتگو

جاری تھی کہ امام جعفر صادق علیہ السلام کا ادھر سے گزر ہوا اور آپؑ نے سورۂ اسرار کی یہ آیت پڑھی :

"قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا۔"

"اے رسولؐ کہہ دو کہ اگر پورے جہان کے جن وانس اس بات پر اکٹھا ہوں کہ اس قرآن کا مثل لے آئیں تو ممکن نہیں ہے کہ اس کے برابر لاسکیں اگرچہ اس کوشش میں وہ ایک دوسرے کے مددگار بھی ہوں ۔"

یہ سُن کر وہ چاروں حیران ہو کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے اور اعتراف کیا کہ اگر اسلام کی کوئی حقیقت ہے تو رسول اللہؐ کا حقیقی وارث اور جانشین جعفرؑ ابن محمدؑ ہی ہے ۔ ہم نے جب بھی اس کی طرف دیکھا تو ہم پر ہیبت طاری ہو کر ہمارے رونگٹے کھڑے ہوگئے ۔ اس کے بعد وہ چاروں اپنے عجز کا اقرار کرتے ہوئے اپنے ارادے میں ناکام ہو کر ایک دوسرے سے جدا ہوگئے ۔

(احتجاج طبرسی جلد دوم صفحہ ۳۷۷)

ج ـــــ فسادِ اخلاقی جیسی مہلک بیماریاں امت کے رگ وپے میں

سرایت کرکے رفتہ رفتہ پورے جسدِ امت کو اپنی لپیٹ میں لے رہی تھیں کہ خداوندِ متعال نے اپنا کرم فرمایا اور روحِ انسانی کو فسادِ اخلاقی کے جراثیم سے محفوظ رکھنے کے لیے حکیم حاذق طبیب روحانی محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مبعوث فرمایا۔ آپؐ نے اپنی غرضِ بعثت کے ایک اہم حصے کو متممِ اخلاق بتایا۔ اور اپنے بعد اپنی امت کو بے سہارا نہیں چھوڑا بلکہ اپنے بعد اپنی امت کے لیے قرآن جیسا نسخۂ کیمیا چھوڑا اور اپنے علم کے وارث اپنے بارہ جانشینوں کی نشان دہی فرما کر گئے۔ فسادِ اخلاقی جیسے مہلک مرض سے بچانے کے لیے ائمۂ اطہار علیہم السلام نے جو مساعی اور کوششیں فرمائیں اس کا واضح اور زندہ ثبوت طبیبِ الٰہی، حکیم حاذق معصوم ششم حضرت امام سجاد علیہ السلام کا نسخۂ کیمیا، صحیفۂ سجادیہ کے نام سے موجود ہے اور ہماری دسترس میں ہے لیکن اس بدقسمتی کو کیا کہیے کہ آج جبکہ پھر اسی مہلک بیماری کے جراثیم امت کے جسم میں سرایت کر چکے ہیں ہم اس نسخۂ کیمیا سے استفادہ کرنے کی بجائے لغو لٹریچر اور بے ہودہ و بے مقصد فلموں میں اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔

حکام کے انحرافات پر انتقاد کرنا

نفس حکام

منصور دوانیقی نے امام صادق علیہ السلام کو لکھا کہ:

" آپ ہمارے پاس کیوں تشریف نہیں لاتے جس طرح کہ دوسرے ہمارے پاس آتے ہیں ۔"

آپؑ نے جواب دیا کہ :

" ہمارے پاس کوئی ایسی چیز نہیں کہ جس کی وجہ سے ہمیں تم سے ڈر ہو اور نہ تمھارے پاس آخرت سے مربوط کوئی چیز ہے کہ جس کی ہم امید رکھیں ۔ نہ تم کو کوئی نعمت ملی ہے کہ جس کی ہم تمھیں تہنیت پیش کرنے آئیں ۔ اور نہ ہی تم کسی مصیبت میں ہو کہ ہم تمھیں تعزیت پیش کرنے آئیں ۔ جب ان میں سے کوئی بھی وجہ موجود نہیں ہے تو ہمارا تمھارے پاس آنا بے مقصد ہے ۔"

منصور نے جواب لکھا کہ :

" آپ تشریف لائیں اور ہمیں نصیحت فرمائیں ۔"

امامؑ نے جواب دیا کہ :

" جو دنیا چاہتے ہیں وہ تمھیں نصیحت نہیں کریں گے اور جو آخرت چاہتے ہیں وہ تمھارے ساتھ نہیں رہیں گے ۔"

آمریت کے ساتھ تعاون کی مذمّت

سلیمان جعفری نے امام رضا علیہ السلام سے سوال کیا کہ :

" آیا حکامِ جور کے ساتھ تعاون کرنا اور ان کے اعمال

میں شریک ہونا صحیح ہے ؟"

امامؑ نے جواب دیا کہ :

" اے سلیمان ! ان کے کسی عمل میں شریک ہونا، یا ان سے تعاون کرنا یا ان کی کسی حاجت کو پورا کرنا کفر کے مترادف ہے ۔"

ابوبصیر نے امام محمد باقر علیہ السلام سے جب اسی مسئلہ سے متعلق سوال کیا کہ :

" آیا ان کے ساتھ کسی قسم کا تعاون کرنا چاہیے ؟"

تو امامؑ نے فرمایا کہ :

" نہیں ۔ یہاں تک کہ قلم بھی نہیں تراشش سکتے ۔"

زیاد ابن ابی سلمٰی نے امام موسیٰ ابن جعفر علیہ السلام سے نقل کیا ہے کہ امامؑ نے فرمایا کہ :

" اے زیاد ! مجھے ان کے کسی عہدے کو قبول کرنے سے زیادہ یہ امر پسند ہے کہ میں اس چھت سے گر جاؤں اور ٹکڑے ٹکڑے ہو جاؤں ۔ حتیٰ کہ مجھے ان کے فرش پر چلنا بھی پسند نہیں ۔"

صفوان جمال رقم کرتے ہیں کہ :

" میں امام موسیٰ بن جعفر علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے مجھ سے فرمایا :

" اے صفوان ! ایک کام کے سوا تمھارے سب کام اچھے ہیں ۔"

میں نے عرض کی:

"اے فرزندِ رسولؑ، میں آپؑ کے صدقے وہ ایک کام کون سا ہے؟"

امامؑ نے فرمایا:

"وہ یہ ہے کہ تم اپنے اونٹ اس مرد (ہارون رشید) کو کرائے پر دیتے ہو۔"

میں نے کہا:

"خدا کی قسم! میں اپنے اونٹ حرام، گناہ، باطل، شکار اور عیاشی کے کاموں کے لیے نہیں دیتا بلکہ میں نے اس کو اپنے اونٹ مکے جانے کے لیے کرایہ پر دیے ہیں۔"

امامؑ نے فرمایا:

"اے صفوان! کیا تمھارے کرایے کی شرط یہ ہے کہ وہ واپس آجائیں؟"

میں نے کہا:

"بے شک ——— !"

آپؑ نے فرمایا:

"کیا تم چاہتے ہو کہ وہ زندہ واپس آجائیں تاکہ تمھارا کرایہ وصول ہو جائے۔؟"

میں نے عرض کیا:

"جی ہاں ——— !"

آپؑ نے فرمایا:

"فَمَنْ اَحَبَّ بَقَآءَهُمْ فَهُوَ مِنْهُمْ وَمَنْ كَانَ مِنْهُمْ فَهُوَ كَانَ وَرَدَ النَّارَ۔"

"جو ان کے زندہ رہنے کو اچھا سمجھتا ہے وہ انھیں کے زمرے میں داخل ہے اور جو ان کے زمرے میں داخل ہے وہ دوزخ کی آگ میں ڈالا جائے گا۔"

صفوان کہتا ہے کہ:

"میں گیا اور میں نے تمام اونٹ بیچ دیے۔"

یہ روایات اس امر کی شاہد ہیں کہ ائمہ اطہار علیہم السلام اپنے ماننے والوں کو حکامِ جور کے ساتھ ہر قسم کے تعاون اور ان کی مدد کرنے سے روکتے تھے مگر سوائے چند مخلص افراد کے جن پر آپؑ کو کامل بھروسہ اور اعتماد تھا یا پھر خود ان کے بقول ائمہ اطہارؑ اس غرض سے اجازت دیدیتے تھے کہ حکام باطل کے دروازوں پر اہل حق کی فریاد رسی ہوسکے اور ان کا دفاع ہوسکے ورنہ عام طور پر تعاون کرنے سے سختی کے ساتھ منع فرماتے تھے۔

چنانچہ حکومت کے ساتھ تعاون کرنے سے منع کرنا خود اپنی جگہ ائمہ اطہار علیہم السلام کی، آمریت کے خلاف مزاحمت کی دلیل ہے۔

امام محمد باقر علیہ السلام سے سوال کیا گیا کہ:

"کیا ان کی حکومت میں ہم شریک ہوسکتے ہیں؟"

امامؑ نے فرمایا کہ:

"نہیں! یہاں تک کہ قلم تک نہیں تراش سکتے۔"

امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ:

"ان حکومتوں میں شریک ہونا۔ حق کو پائمال کرنے، باطل کو زندہ کرنے، مومنین اور انبیاء کو قتل کرنے، سنت و شریعتِ خدا کو تبدیل کرنے اور مساجد کو ویران کرنے کے مترادف ہے۔"

امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ:

"اگر کسی نے ان کے سامنے عصا رکھا تو یہ عصا قیامت میں آگ کا اژدھا بنے گا جس کی لمبائی ستّر ہاتھ کے برابر ہوگی اور وہ اسی شخص پر مسلط ہوگا۔ جب قیامت کا دن ہوگا تو منادی اعلان کرے گا کہ ظالمین کے ساتھ تعاون کرنے والے کہاں ہیں؟"

"اگر وہ مسجد بنائیں تو ان کی مدد نہ کرو۔ اگر کسی نے اپنے نام کو ان ظالمین کی فہرست میں داخل کیا تو خدا اس کو قیامت کے دن خنزیر کی شکل میں محشور کرے گا۔"

عدالتوں کا بائیکاٹ

تاریخ قدیم سے آج تک تمام حکومتیں تین بنیادی اداروں کی حامل رہی ہیں۔

○ —— مقننہ

○ —— مجریہ

○ —— عدلیہ

یہی تین ادارے پوری مملکت کے نظم ونسق کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔

ان تین اداروں میں بھی سب سے اہم ادارہ عدلیہ کا ہے کہ جس سے ملت کی سعادت اور شقاوت مربوط ہے۔

عدلیہ وہ سب سے بالا ادارہ ہے کہ جہاں حق و باطل کی تمیز ہوتی ہے اور ظالم و مظلوم کے درمیان انصاف ہوتا ہے۔ شریعت میں اس منصبِ اعلیٰ کو انبیاءؑ اور ائمۂ اطہارؑ اور فقہائے جامع الشرائط کا منصب بتایا گیا ہے۔

خداوند عالم فرماتا ہے:

"اے داؤد! ہم نے تمھیں زمین پر خلیفہ قرار دیا ہے تم زمین میں عدل وانصاف کے ساتھ حکم کرو۔"

دوسری جگہ پیغمبر اکرمؐ سے خطاب ہوتا ہے:

"اے نبیؐ! یہ لوگ اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ آپؐ کو اپنے متنازعہ مسائل میں حَکَم تسلیم نہ کرلیں۔"

امیر المومنین علیہ السلام نے شریح قاضی سے فرمایا:

"اے شریح قاضی! جس منصب پر تو بیٹھا ہے، یہاں نبیؑ بیٹھ سکتا ہے یا وصیٔ نبیؑ یا پھر شقی ترین فرد۔"

عقل وشرع کی رو سے اس منصب کی جو عظمت اور بلندی ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ کسی بھی ملت کی سعادت وشقاوت کا دار و مدار اسی

ادارۂ عدالت سے مربوط ہے۔

اگر کسی معاشرے کا عدالتی نظام کج روی و انحراف کا شکار ہو تو ایسی صورت میں پورا معاشرہ ہلاکت و فلاکت کی کھائی میں گر پڑتا ہے۔

اس انحراف و کج روی کے نتیجے میں نہ صرف مظلوم اپنے حق کے حصول میں ناکام رہتا ہے بلکہ ظالم و ستم پیشہ افراد کی بھی بن آتی ہے اور وہ بے دریغ ظلم و ستم کا بازار گرم کیے رکھتے ہیں۔

اس ادارہ کی کج روی اور انحراف کا نہایت بدترین پہلو ایک اور بھی ہے اور وہ یہ کہ اس کجی اور انحراف کے نتیجے میں خود قانون بھی اپنی حیثیت، حقیقت اور اثر کھو بیٹھتا ہے۔ اور اس کی من مانی تاویلیں کی جاتی ہیں۔ اور مظلوم و بے کس افراد بلا چون و چرا عدالتی فیصلے کو قبول کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ کیونکہ اس فیصلہ پر انگشت نمائی بھی توہین عدالت کے جرم میں انھیں سزا کا حقدار بنا سکتی ہے۔

اس صورتحال میں مظلوم و ستم رسیدہ افراد کے پاس ایک ہی راہ رہ جاتی ہے۔

یا تو وہ اس عدالت کے ہر جائز و ناجائز فیصلہ کی پابندی کریں۔

یا وہ اس ادارہ کی جانب رجوع ہی نہ کریں،

اور اپنے حق سے خاموشی کے ساتھ دستبردار ہو جائیں۔

اس ادارے کی اہمیت کے پیش نظر امیر المومنین علی ابن ابی طالب (ع) مالک اشتر کے نام عہد نامہ میں خود اس منصب کے بارے میں اور اس منصب کے لیے منتخب کیے جانے والے شخص کو جن خصوصیات اور صفات کا حامل ہونا چاہیے ان کے بارے میں یوں فرماتے ہیں:

قاضی کی صفات

" لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرنے کے لیے ایسے شخص کو منتخب کرو کہ جو تمھارے نزدیک تمھاری رعایا میں سب سے بہتر ہو۔ جو واقعات کی پیچیدگیوں سے ضیق میں نہ پڑ جاتا ہو اور نہ جھگڑا کرنے والوں کے رویہ سے غصہ میں آتا ہو۔ نہ اپنے کسی غلط نقطہ نظر پر اَڑتا ہو، نہ حق کو پہچان کر اس کے اختیار کرنے میں طبیعت پر بار محسوس کرتا ہو، نہ اس کا نفس ذاتی طمع پر جھک پڑتا ہو اور نہ پوری طرح چھان بین کیے بغیر سرسری طور پر کسی معاملہ کو سمجھ لینے پر اکتفا کرتا ہو۔ شک و شبہ کے موقع پر قدم روک لیتا ہو۔ دلیل و حجت کو سب سے زیادہ اہمیت دیتا ہو۔ فریقین کی بحثا بحثی سے اکتا نہ جاتا ہو۔ معاملات کی تحقیق میں بڑے صبر و ضبط سے کام لیتا ہو اور جب حقیقت عیاں ہو جاتی ہو تو بے دھڑک فیصلہ کر دیتا ہو۔ وہ ایسا ہو جسے سراہا جانا مغرور نہ بنائے پھر یہ کہ تم خود ان کے فیصلوں کا بار بار جائزہ لیتے رہنا۔"

مزید ارشاد فرماتے ہیں:

" اس بارے میں انتہائی بالغ نظری سے کام لینا کیونکہ

(اس سے پہلے) یہ دین بدکرداروں کے پنجے میں اسیر رہ چکا ہے جس میں نفسانی خواہشوں کی کارفرمائی تھی اور اسے دنیا طلبی کا ایک ذریعہ بنالیا گیا تھا۔"

" پھر اپنے عہدیداروں کے بارے میں نظر رکھنا ان کو خوب آزمائش کے بعد منصب دینا۔ کبھی صرف رعایت اور جانبداری کی بنا پر انھیں منصب عطا نہ کرنا۔ اس لیے کہ یہ باتیں ناانصافی اور بے ایمانی کا سرچشمہ ہیں۔ اور ایسے لوگوں کو منتخب کرنا جو آزمودہ اور غیرت مند ہوں، ایسے خاندانوں میں سے جو اچھے ہوں اور جن کی خدمات اسلام کے سلسلے میں پہلے سے ہوں ان کو منتخب کرنا۔ کیونکہ ایسے لوگ بلند اخلاق اور بے داغ عزت والے ہوتے ہیں۔ حرص و طمع کی طرف کم جھکتے ہیں اور عواقب و نتائج پر زیادہ نظر رکھتے ہیں پھر ان کی تنخواہوں کا معیار بلند رکھنا کیونکہ اس سے انھیں اپنے نفوس کے درست رکھنے میں مدد ملے گی۔"

لہٰذا جب تک یہ منصب مستقل، آزاد اور ہر قسم کے بیرونی دباؤ اور اثرات سے محفوظ نہیں ہوگا اس ادارے سے متوقع نتائج نہیں حاصل کیے جاسکتے۔ اگر یہ ادارہ یا قاضی اپنے فرضِ منصبی سے منحرف ہوجائے تو نہ یہ ادارہ عدالتی ادارہ رہے گا اور نہ ہی مظلوم کا فریادرس۔ بلکہ ظالم کی پشت پناہی کا سبب ہوگا اور رفتہ رفتہ یہ خود ایک آمرانہ نظام کی صورت اختیار کرے گا۔

ائمہ اطہارؑ، طاغوتی حکومتوں سے وابستہ عدالتوں کے انحراف اور اس کے

نتیجہ میں لوگوں کے حقوق کی پائمالی اور ظلم و ستم کی پشت پناہی کے طرزِ عمل کو دیکھتے ہوئے اپنے ماننے والوں اور پیروؤں کو تاکید فرماتے تھے کہ اپنے معاملات میں ان عدالتوں کی طرف رجوع نہ کریں اور ان کو اپنا حکم بنانے اور ان سے فیصلہ لینے کی بجائے خود اپنے اندر ہی سے عادل و عالم افراد کو انتخاب کریں اور اپنے معاملات میں ان سے فیصلہ لیں اور انہی کو حکم قرار دیں۔

عمر ابن حنظلہ نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا کہ :

"اگر ہمارے اصحاب کے دو آدمیوں کے درمیان میراث یا قرض سے متعلق تنازع ہو جائے اور وہ اپنے تنازع کے دعویٰ کو حکام وقت کی عدالتوں میں لے جائیں تو کیا یہ جائز ہے ؟"

امامؑ نے فرمایا :

"جو شخص اپنے دعویٰ کو ان عدالتوں میں لے جائے خواہ دعویٰ حق پر مبنی ہو یا باطل پر تو گویا اس نے طاغوت کی طرف رجوع کیا اور (دعویٰ کے نتیجہ میں) جو ان عدالتوں سے ملے وہ حرام ہے اگرچہ وہ اس کا حق ہی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ اس نے وہ طاغوت کے فیصلے کے تحت لیا جبکہ خداوندِ عالم نے طاغوت کو مسترد کرنے کا حکم دیا ہے۔ جیسا کہ (سورہ نساء۔ آیت ۶۰ میں) وہ فرماتا ہے کہ :

"وہ چاہتے ہیں کہ طاغوت کو اپنا حاکم بنائیں حالانکہ ان کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ ان کو مسترد کریں۔"

عمر ابنِ حنظلہ نے عرض کیا کہ:

"پھر ان دونوں کے درمیان کیسے فیصلہ ہو؟"

تو امامؑ نے فرمایا کہ:

"فریقین ایسے افراد کو تلاش کریں کہ جو ہمارے حلال و حرام کی بصیرت و آگاہی رکھتے ہوں۔"

(نوٹ: بصیرت و آگاہی سے امامؑ کی مراد اجتہاد ہے۔)

امامؑ فرماتے ہیں کہ:

"فریقین کو ایسے عالم یا مجتہد کی طرف رجوع کرنا چاہیے بہ تحقیق ہم نے ان کو تمھارے اوپر حاکم قرار دیا ہے۔ اگر ایسے منتخب حاکم کے فیصلہ کو کوئی شخص مسترد کرے جبکہ فیصلہ ہماری تعلیمات کے مطابق ہو تو گویا اس نے ہم کو مسترد کیا اور ہمیں مسترد کرنا شرک کے مترادف ہے۔"

چنانچہ ابی خدیجہ سالم بن مکرم جمالی سے مروی ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ:

"پرہیز کرو اور محتاط رہو۔ اپنے اختلافات کے دعووں کو طاغوت کی طرف مت لے جاؤ۔ بلکہ اپنوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرو کہ جو ہمارے احکام کو جانتا ہو۔ اس کو اپنے درمیان حکم قرار دو۔ بہ تحقیق ان کو ہم نے تمھارے اوپر حاکم مقرر کیا ہے۔ تم بھی اپنے معاملات ان کے پاس لے جاؤ۔" (تکملۃ المنہاج جلد اوّل صفحہ ۸)

امتِ اسلامی کو انحرافات سے بچانا

ائمہ اطہارؑ نے طاغوت اور آمریت کے خلاف نبرد آزما ہونے کے لیے جس تنظیم کو منظم فرمایا اس کی اس انداز سے تربیت فرمائی کہ وہ غلط احزاب اور منحرف گروہوں سے ہمیشہ ہوشیار اور چوکنے رہیں اور غلط افراد کو اپنی تنظیم میں داخل نہ ہونے دیں۔ اور ان سے ہمیشہ محتاط رہیں۔

اس کی چند مثالیں پیش خدمت ہیں۔

جب بنی عباس نے یہ محسوس کیا کہ بنی امیہ کے خلاف ان کی تحریک آلِ محمدؐ کے نام کے بغیر کامیاب نہیں ہوگی تو انھوں نے اپنے درپردہ حامی ابو مسلم خراسانی سے امام جعفر صادق علیہ السلام کو خط لکھوایا۔ کہ ہم نے لوگوں کو آپؑ کی طرف دعوت دی ہے اور اگر آپؑ چاہیں تو ہم آپؑ کے ساتھ ہیں۔

امامؑ نے اس خط کا جواب یوں دیا کہ :

" نہ تم میرے آدمیوں میں سے ہو اور نہ یہ زمانہ میرا زمانہ ہے۔"

(ائمہ اثناعشر صفحہ ۱۸۲

نقل از ملل و نحل شہرستانی جلد اول صفحہ ۲۴۱)

ابو مسلم خراسانی نے دوسرا خط تین آدمیوں کی طرف بھیجا۔ ایک عمر اشرف ابن امام زین العابدینؑ کے نام۔ دوسرا عبداللہ ابن حسن کے نام اور تیسرا امام جعفر صادقؑ کے نام۔ اور اپنے قاصد کو ہدایت دی کہ وہ پہلے امام جعفر صادق کے پاس خط لے جائے اور اگر وہ اسے مسترد کریں تو عبداللہ بن حسن کے پاس خط لے جائے اور اگر وہ بھی اسے مسترد کردیں تو پھر خط عمر اشرف ابن امام زین العابدین کو دے۔

جب یہ خط امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں پہنچا تو امامؑ نے فرمایا کہ:

" میرے اور ابو مسلم خراسانی کے درمیان کیا واسطہ ہے جبکہ وہ میرا نہیں بلکہ کسی اور کا شیعہ ہے۔"

اور یہ فرما کر امامؑ نے چراغ طلب کیا اور خط کو دیکھنے سے پہلے ہی جلا دیا۔
ابو مسلم خراسانی کے قاصد نے جب خط کا جواب طلب کیا تو امامؑ نے فرمایا کہ:

" جو کچھ تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے وہ ہی اس خط کا جواب ہے۔"

جب دوسرا خط عبداللہ بن حسن کے پاس پہنچا تو عبداللہ بن حسن نے کہا کہ:

" میں تو عمر رسیدہ ہو چکا ہوں البتہ میرا فرزند محمد نفس زکیہ اس منصب کے لیے مناسب و بہتر ہے۔"

اور قاصد سے کہا کہ:

" میرے بیٹے نفس زکیہ سے بیعت کرو۔"

(ائمہ اثنا عشر صفحہ ۱۸۳ نقل از تاریخ یعقوبی

نیز رحاب ائمہ جلد چہارم صفحہ ۴۶)

جب یہ خبر امام جعفر صادق علیہ السلام کو پہنچی کہ عبداللہ ابن حسن نے اس پیشکش کو قبول کر لیا ہے تو امامؑ نے ان سے فرمایا:

" اے ابو محمد! اہل خراسان کب سے آپ کے شیعہ بنے ہیں؟ کیا آپ نے ابو مسلم کو خراسان میں تحریک چلانے کے لیے بھیجا تھا؟ کیا آپ نے ان کو حکم دیا تھا کہ کالے کپڑے پہن لیں؟ کیا یہ جو عراق سے آئے ہیں

آپ نے ان کو بلایا تھا ؟ کیا آپ ان کو جانتے ہیں؟
نہ یہ لوگ آپ کو جانتے ہیں نہ آپ ان کو جانتے
ہیں ۔ میں ہر مسلم کو نصیحت کرنا فرض سمجھتا ہوں میں
آپ کو نصیحت کرنے سے کیسے باز رہ سکتا ہوں؟
آپ اس قسم کی غلط امیدیں نہ رکھیں ۔"

(ائمہ اثنا عشر صفحہ ۱۸۳ ۔ نقل از مسعودی
نیز رھاب ائمہ جلد چہارم ۔ صفحہ ۴۶)

ان روایات کے علاوہ کئی اور روایات بھی اس بات کی دلیل ہیں کہ جہاں ائمہ اطہار علیہم السلام مخلص و باایمان مجاہدین کی تائید کے ساتھ ساتھ ان کے دوسرے مسائل کی ذمہ داری بھی لیتے تھے وہاں وہ ان افراد کو غلط احزاب اور غلط شخصیتوں کے ہاتھوں استعمال ہونے سے باز رکھنے کے لیے ہدایت بھی فرماتے رہتے تھے ۔ اور انھیں متنبہ کرتے رہتے تھے ۔

دور حاضر میں بھی جو احزاب و افراد دین کی دعوت لے کر اٹھے ہیں اور خلوص نیت اور عزم صمیم کے ساتھ اس راہ میں قدم بڑھانے پر آمادہ ہیں انھیں ائمہ اطہارؑ کے ان ارشادات و ہدایات کو مشعل راہ بنانا چاہیے ۔ اور دیگر احزاب و افراد کے ساتھ تعاون واشتراک عمل کرتے وقت ان ارشادات کو پیش نظر رکھنا چاہیے ۔

چنانچہ ہمارے ملک میں لادینیت اور سیکولرازم پر مبنی وہ تحریکیں اور تنظیمیں جو مبدار اور معاد پر ایمان کی دعویدار ہیں اور ائمہ کی محبت کا بھی دم بھرتی ہیں انھیں چاہیے کہ وہ آپ سے تعاون کریں ۔ کیونکہ آپ مبدار و معاد پر ایمان کے ساتھ ساتھ الٰہی نظام کی ترویج کے لیے بھی سرگرم عمل ہیں ۔ اور کیونکہ وہ غیر الٰہی اور طاغوتی نظام کے نفاذ کے داعی ہیں اس لیے آپ کے لیے ان کے ساتھ

تعاون کی کوئی گنجائش نہیں۔ سورہ قُلْ يَاۤاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ.....الخ اور ائمہ اطہارؑ کے مذکورہ بالا ارشادات اس کے شاہد و گواہ ہیں۔

حضرت امیر علیہ السلام فرماتے ہیں:

" دائیں بائیں گمراہی کی راہیں ہیں اور درمیانی راستہ ہی صراطِ مستقیم ہے۔ اس راستے پر اللہ کی ہمیشہ رہنے والی کتاب اور نبوت کے آثار ہیں۔ اسی سے شریعت کا نفاذ و اجراء ہوا اور اسی کی طرف آخر کار بازگشت ہے۔"

(نہج البلاغہ۔ خطبہ ۱۶)

---

۲ فکرِ اسلامی کی تشہیر

اپنے غصب شدہ حق کی بازیابی اور مسلمانوں پر مسلط نااہل حکمرانوں سے نجات کی غرض سے ائمہؑ نے دینِ مبین اور امتِ محمدیؐ کو انحراف و کج روی سے بچانے کے ساتھ ساتھ دوسرا قدم یہ اٹھایا کہ مسلمانوں کے سامنے اسلامِ محمدی کا اصل چہرہ پیش کیا تا کہ مسلمان حقیقی اسلام اور حکمرانوں کے پیش کردہ اسلام کے درمیان تمیز کر سکیں۔

اس دور میں جبکہ اسلام کو فقط اپنے اقتدار کو طول دینے کا ذریعہ بنایا جا رہا تھا اور اسلام اور رسولِ اسلامؐ سے مسلمانوں کی گہری عقیدت کے پیش نظر ایسی باتیں منسوب کی جا رہی تھیں جن کا اسلام کی حقیقی تعلیمات سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ اور جو فقط حکمرانوں کے اقتدار کی مدت دراز کرنے کی غرض سے تھیں۔

مسلمانوں کو ایک ایسے مرکز کی ضرورت تھی جو اسلام کی حقیقی تعلیمات کو پیش کرسکے۔ ائمہ طاہرین علیہم السلام نے مسلمانوں کو اس نوع کا مرکز فراہم کیا اور ملحدانہ نظریات اور غیر اسلامی افکار کے مقابل اسلام کی ارفع تعلیمات کو مسلمانوں کے سامنے پیش کیا۔ نیز اپنے شاگردوں کی اس طرح تربیت فرمائی کہ وہ جدید پیش آمدہ مسائل اور پیچیدگیوں کا اسلامی تعلیمات کے مطابق حل پیش کرسکیں۔

ائمہ طاہرین علیہم السلام کے دور میں بھی لوگ اگرچہ دین سے وابستہ تھے اور اسلام سے گہری قلبی وابستگی رکھتے تھے لیکن اسلامی تعلیمات کی اصل روح اس کے حقیقی فلسفہ سے ناآشنا تھے۔ (بالکل اسی طرح کہ جیسے آج کے دور میں عام طور سے لوگ مبداء اور معاد پر یقین رکھتے ہیں لیکن یہ وابستگی فقط قلب کی حد تک ہے۔ عملاً مسلمانوں کی زندگیوں میں دین رائج نہیں اور روزمرہ زندگی کے معاملات میں احکاماتِ دینی کا عمل دخل تقریباً مفقود ہے۔ خصوصاً اجتماعی معاملات میں تو حالات نہایت ہی دگرگوں ہیں۔ مسلمان اپنے اجتماعی معاملات و مسائل کا حل کبھی مغربی فلسفہ و تعلیمات میں ڈھونڈتے نظر آتے ہیں اور کبھی مشرق کے بے بنیاد نعروں کے فریب میں آکر اپنا رخ اس طرف کر دیتے ہیں۔)

لہٰذا امامت کی دوررس نظروں نے اس خطرے کا ادراک کرتے ہوئے اس سے نبرد آزما ہونے کے لیے ایک عظیم اور وسیع پیمانے پر فکرِ اسلامی کی تشہیر کا بیڑا اٹھایا تاکہ اس فکر کی جڑیں عوام میں پھیل جائیں۔

چنانچہ ائمہ اطہارؑ نے جہاں اپنے خاص دوستوں اور موالیان کی فکر کو صحیح خطوط پر استوار کرنے کی سعی فرمائی وہیں عوام الناس کی علمی اور فکری تربیت کے لیے بھی اقدام فرمایا اور ایسی عظیم درسگاہیں قائم کیں جہاں سے

ہر شخص اپنے ظرف اور اپنی استعداد کے مطابق مستفیض ہو سکتا تھا۔ چنانچہ ہزاروں افراد نے ائمہ معصومین ؑ سے شرف تلمذ حاصل کیا۔

اس عظیم درس گاہِ امامت سے کسبِ علم کر کے فقہاء، مجتہدین اور مؤلفین کی جو عظیم ہستیاں نکلیں ان میں سرفہرست شخصیات یہ ہیں :

جابر ابنِ حیان انصاری

انھوں نے مختلف موضوعاتِ اسلامی پر پانچسو کتابیں تالیف و تصنیف کیں جن کا آج مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

ابان بن تغلب ربیعی کوفی

انھوں نے معانی قرآن اور اصولِ مذہب شیعہ پر کتاب لکھی۔

علی ابن یقطین

انھوں نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے حفظ کی ہوئی تمام حدیثوں کو ایک کتاب کی شکل میں پیش کیا۔

مفضل بن عمر وا

انھوں نے امام صادق علیہ السلام کے دروس پر مشتمل کتاب توحید تالیف کی۔ جس میں امام ؑ نے علم فزیالوجی سے استدلال کرتے ہوئے وجود خدا کو ثابت کیا ہے۔ یہ کتاب آج بھی ہمارے پاس موجود ہے اور علمِ اعضائے انسانی کے طالب علم اور اطباء بھی اس سے مستفیض ہوتے ہیں۔

ابو محمد شیبانی

انھوں نے کائنات کے حدوث اور ملحدین کے رَد میں کتاب تصنیف کی۔

محمد ابن مسلم

انھوں نے امام محمد باقر علیہ السلام سے تیس ہزار اور امام جعفر صادق علیہ السلام سے سولہ ہزار حدیثیں حفظ کر کے دنیائے انسانیت کے لیے پیش کیں۔

انھوں نے (چار سو احادیث پر مشتمل) ایک کتاب "حدیثِ اربعمأتہ" لکھی۔ ان کی شخصیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایک مرتبہ عبداللہ ابن ابی لیغفور نے امام صادقؑ سے کہا کہ:

"لوگ ہم سے مسائل پوچھتے ہیں اور ہم (مسائل معلوم کرنے کے لیے) ہر وقت آپؑ کی خدمت میں حاضر نہیں ہوسکتے۔"

تو امام علیہ السلام نے فرمایا کہ:

"تمھیں کیا چیز مانع ہے کہ تم محمد ابن مسلم سے مسائل نہیں پوچھتے؟ وہ میرے پدر بزرگوار کے شاگرد اور وجیہ اور مقرب شخص ہیں۔"

اسی طرح ایک شخص نے ابوحنیفہ سے اس عورت کے بارے میں مسئلہ پوچھا کہ جو مر چکی تھی اور اس کے شکم میں بچّہ زندہ تھا تو ابوحنیفہ نے کہا کہ:

"تم محمد ابن مسلم کے پاس جاؤ اور وہ اس مسئلے کا

جو جواب دیں وہ آکر مجھے بھی بتاؤ۔"

حمران ابن اعین

امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ وہ (حمران بن اعین) حقیقی مومنوں میں سے ہے۔

انھوں نے علم لغت، علم کلام اور علم قرآن میں اجتہاد کیا۔

زرارہ ابن اعین

یہ وہ ہستی ہیں کہ جن سے امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ:

"واللہ! ہم تم سے راضی ہیں۔"

ایک دن فیض بن مختار نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایات میں موجود اختلافات کے بارے میں دریافت کیا۔ امامؑ نے زرارہ (کہ جو وہاں موجود تھے) کی طرف اشارہ فرما کر کہا:

"تم ان سے رجوع کرو۔"

ان شخصیات میں کچھ ایسی ہستیاں بھی موجود ہیں جن کے بارے میں امامؑ فرماتے ہیں کہ:

"اگر یہ ذوات نہ ہوتیں تو آثارِ نبوت مٹ جاتے۔"

ائمہ اطہار علیہم السلام نے مسلم معاشرے کی تشکیل اور امت مسلمہ کی تنظیم میں جہاں سعی و کوشش فرمائیں اور زحمتیں برداشت کیں وہاں مکتب

اہلبیتؑ سے منسلک افراد اور شیعیان اہلبیت کی تربیت کا خصوصی اہتمام بھی فرمایا اور ان کے لیے ان حدود اور ابعاد کا تعین فرمایا کہ جن سے باہر رہنے کی آپ کے شیعیان اور موالیان کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔

ائمہ اطہارؑ نے اپنے شیعوں پر صاف طور سے واضح فرمادیا کہ اگر ہم سے متمسک رہنا ہے تو ان حدود کی پابندی لازمی ہے۔

ائمہؑ کی نظر میں شیعیت کا معیار

حضرت امیرالمومنین امام علی علیہ الصلوٰت والسلام فرماتے ہیں کہ:

" لوگ تین قسم کے ہیں :

(۱) ـــــ عالم

(۲) ـــــ متعلم اور

(۳) ـــــ ہمج الرعیٰ (گھاس پھوس) "

آپ فرماتے ہیں کہ:

" عالم تو ہم ہیں جبکہ ہمارے شیعہ متعلم لوگوں کی صف میں آتے ہیں اور باقی تیسرے گروہ کے لوگوں کی مثال گھاس اور پھوس کی مانند ہے "

(نہج البلاغہ)

اس روایت کے تحت جو بھی علوم ائمہ اطہار سے محروم ہے وہ آپ کے شیعوں کے دائرے سے باہر ہے۔ کیونکہ امامؑ نے لوگوں کو تین گروہوں پر تقسیم کیا ہے اور اس کے علاوہ کوئی چوتھا گروہ نہیں ہے۔ چنانچہ اس روایت کی رو سے شیعوں اور دوسرے لوگوں کے درمیان پہلی امتیازی حدِفاصل " علم " ہے۔

امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں کہ :

" اے خیثمہ! ہمارے شیعوں تک یہ بات پہنچا دو کہ ہم ان کو عذاب الٰہی سے نہیں بچائیں گے مگر ان کو کہ جو باعمل ہوں۔
ہماری ولایت کی حد میں داخل نہیں ہوتے مگر وہ کہ جو اہلِ تقویٰ و ورع ہوں ۔"

(اصول کافی جلد دوم صفحہ ۷۶)

اسی مضمون کی دوسری حدیث ہے کہ امام محمد باقر علیہ السلام نے جعفر جعفی سے فرمایا کہ :

" کیا شیعہ ہونے کے لیے یہ کافی ہے کہ وہ کہے کہ میں اہلبیتؑ سے محبت رکھتا ہوں؟ خدا کی قسم! ہمارا شیعہ نہیں مگر وہ جو خدا سے ڈرے اور اس کی اطاعت کرے ۔"

(مکاتب تشیع صفحہ ۱۶۴. نقل از اصول کافی جلد دوم صفحہ ۷۴)

ان احادیث سے واضح ہے کہ ائمہ اطہار علیہم السلام کی نظر میں شیعوں اور دوسرے لوگوں کے درمیان دوسری امتیازی حدِ فاصل "تقویٰ و ورع" ہے ۔

امام محمد باقر علیہ السلام نے سعید ابن حسن سے پوچھا کہ :

" آیا تمھارے یہاں یہ دستور ہے کہ تم میں سے کوئی آدمی اپنے دینی بھائی کے پاس جائے ، اس کی جیب میں ہاتھ ڈالے اور اپنی ضرورت کی رقم اس میں سے نکال لے اور جس کی رقم نکالی جائے وہ اسے منع

نہ کرے۔؟"

سعید نے جواب دیا کہ :

"نہیں ــــــ!"

امام علیہ السلام نے فرمایا :

"پھر تم لوگوں کے درمیان بھائی چارہ نہیں ہے۔"

(مکتب تشیع صفحہ ۱۶۵۔ نقل از اصول کافی جلد دوم صفحہ ۱۷۴)

چنانچہ شیعوں اور دوسرے لوگوں کے درمیان تیسری حد فاصل "شیعوں کا اخلاقِ اجتماعی" ہے۔ جیسا کہ اوپر والی حدیث سے واضح ہے۔

امام علیہ السلام اپنے شیعوں سے فرماتے ہیں کہ :

"تم ہماری طرف لوگوں کو اپنی زبان نہیں بلکہ اپنے عمل سے دعوت دو۔ تمھارا عمل اور تمھارا تقوی و ورع تمھارے شیعہ ہونے کا مظہر ہو۔"

(مکتب تشیع صفحہ ۱۶۴۔ نقل از اصولِ کافی جلد دوم صفحہ ۷۸)

چوتھی امتیازی حدِ فاصل جو شیعوں اور دوسروں کے درمیان ہے وہ امامؑ کے فرمان کے مطابق شیعوں کا "داعی اہلبیت" ہونا ہے۔ لہٰذا ہر شیعہ کو چاہیے کہ وہ اپنے عمل کے ذریعہ ان افراد کو کہ جو اہلبیتِ اطہار سے دور ہیں اہلبیت کی طرف دعوت دینے والا داعی بن جائے۔

بالائی سطور میں بیان کردہ احادیث کی رو سے ائمہ اطہارؑ کی نظر میں شیعہ کہلانے کا مستحق وہی فرد ہے کہ جو اس شریعت کی جستجو کرے کہ جس کے بانی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں اور جس کے محافظ و پاسدار ائمہ اطہارؑ ہیں اور اسی شریعت کا متعلم بنے۔

بصورتِ دیگر حضرت امیر المومنینؑ کے فرمان کے مطابق جس کا تذکرہ ہم اس موضوع کے شروع میں کر چکے ہیں اس کا شمار "ھمج الرّاعی" میں ہوگا کیونکہ اس روایت کی رو سے پہلا گروہ یعنی "عالم" تو خود ائمہ معصومین ہیں۔ اور دوسرا گروہ یعنی "متعلم" شیعیان اہلبیت ہیں۔ اب اگر کوئی ان دونوں گروہوں سے نہ ہو تو یقیناً وہ تیسرے گروہ "ھمج الرّاعی" سے تعلق رکھتا ہے۔

جس طرح یہ حدیث شیعوں کو متعلم کے نام سے متعارف کرواتی ہے اسی طرح یہ بھی اشارہ کرتی ہے کہ یہ متعلم کس مکتب سے وابستہ ہونا چاہیے۔

حدیث سرور کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے:

"میں شہر علم ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ۔"

اب جو لوگ مکتبِ رسولؐ کے پیرو ہونے کے دعویدار ہیں اور خصوصاً وہ لوگ جو شیعیانِ علیؑ کے نام سے منسوب ہیں ذرا جائزہ لیں اور دیکھیں، کہ وہ کس درس گاہ کے طالب علم ہیں۔

وہ اپنے روزمرہ معاملات، اپنے اجتماعی، سیاسی، معاشرتی، معاشی اور اقتصادی امور کس مکتب کی تعلیمات کے مطابق انجام دیتے ہیں۔

دوسری دو روایات سے واضح ہوتا ہے کہ ائمہ اطہارؑ اپنے ماننے والوں اور نہ ماننے والوں کے درمیان "عمل و تقویٰ" کو ہی حدِ فاصل سمجھتے ہیں اور جو بھی "عمل و تقویٰ" کے دائرے میں نہ ہو وہ شیعیت کے دائرے سے باہر ہے۔

ابی الصباح الکنانی نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے عرض کی کہ:

"آپ کے شیعہ ہونے کی وجہ سے ہم کو بہت کچھ

سُنناپڑتا ہے۔"

امامؑ نے پوچھا :

" کیا سُننا پڑتا ہے ________ ؟"

کنانی نے عرض کیا کہ :

" ہمارے اور ان کے درمیان جب گفتگو ہوتی ہے تو آخر میں وہ کہتے ہیں کہ تم جعفری ہو خبیث ہو۔"

امامؑ نے فرمایا :

" کیا ہماری وجہ سے تمھاری توہین ہوتی ہے ؟"

کنانی نے جواب دیا

" ہاں ________ !"

امامؑ نے فرمایا :

" خدا کی قسم ! تم میں سے ہماری پیروی کرنے والے بہت کم ہیں۔ ہمارے اصحاب تو وہ ہیں جو صاحب تقویٰ ہوں، صرف خدا کے لیے عمل صالح بجا لاتے ہوں اور اس کے ثواب کے خواستگار رہوں۔"

(مکتب تشیع صفحہ ۱۶۷-۱۶۶۔ نقل از اصول کافی جلد دوم صفحہ")

---

(۳) جہاد بالواسطہ کا اہتمام

آمریت اور طواغیت کے خلاف ائمہ طاہرینؑ کا تیسرا اہم ترین اقدام

ان حکومتوں کے خلاف بالواسطہ جہاد کا اہتمام اور اس راہ میں سرگرم عمل مجاہدین کی حمایت و مدد تھا۔

جوں ہی جہاد کا لفظ استعمال ہوتا ہے فوراً ذہن کے پردے پر میدان جنگ میں سپاہیوں کی رزم آرائی، تلواروں کی جھنکار اور بہادری و دلاوری کے کارنامے نظر آنے لگتے ہیں۔

اسی بنا پر جوں ہی ہم ائمہ طاہرینؑ کے حوالہ سے جہاد کا تذکرہ کرتے ہیں ذہن میں اسی طرح کا گرم میدانِ جنگ گھوم جاتا ہے۔

جب کہ حقیقت یہ نہیں،

بلکہ لغت کی رو سے اور مفاہیم اسلامی کے تحت جہاد ہر اس کاوش و کوشش کو کہا جاتا ہے جو کسی مقصد کے حصول کے لیے کی جائے۔

چنانچہ مفہوم جہاد میں ایسی کوششیں بھی شامل ہیں جن کے نتیجہ میں راسخ العقیدہ افراد کے گروہ تیار کیے جائیں جو دین مبین کی خدمت اور اس کے نفاذ و رواج کے لیے کوشش کریں۔ اور غیر اسلامی اور منحرف نظریات اور تحریکوں کے مدمقابل سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جائیں۔

اور ایسی سعی و کاوش بھی جہاد ہی کے زمرے میں آتی ہے کہ جس کے نتیجے میں لوگ کسی مقصد و مدعا کے لیے ہر قسم کی قربانی دینے پر آمادہ ہو جائیں۔

لہٰذا ہم اس عنوان کے تحت ائمہ طاہرینؑ کے ایسے اقدامات پر بھی روشنی ڈالیں گے جو آپ علیہم السلام نے صحیح العقیدہ اور باایمان مجاہدین کی حمایت کے سلسلہ میں کیے۔ اور ایسے اقدامات کا بھی تذکرہ کریں گے جو کسی تحریک و انقلاب کے لیے تنظیم سازی اور جہاد مسلحانہ اور شہادت کے لیے تیار کرتے ہیں۔

ساتھ ہی ساتھ ظالم حکومتوں کے ان اقدامات کو بھی بطور مثال پیش

کریں گے کہ جو فقط اپنے اقتدار کے زوال اور مسندِ اقتدار کے چھن جانے کے خطرہ ہی کی صورت میں انجام دیے جاسکتے ہیں۔

اور ظالم حکمرانوں کے ایسے اقدامات خود اس بات کی جانب اشارہ ہیں کہ ائمہ طاہرینؑ کا وجود اور ان کی سرگرمیاں ان حکومتوں کے لیے کس قدر خطرناک تھیں۔

طاغوت کے خلاف صحیح العقیدہ تحریکوں کی تائید

کتاب سرائر میں ابن ادریس حلی نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ آپؑ نے فرمایا کہ:

"ہم اور ہمارے شیعہ ہمیشہ خیر پر ہی رہیں گے جب تک کہ آلِ محمدؐ میں سے طاغوت کے خلاف خروج کرنے والے باقی رہیں گے۔ مجھے خوشی ہوگی کہ آلِ محمدؐ میں سے کوئی ظلم کے خلاف خروج کرے اور اس کے اہل و عیال کا خرچہ میرے ذمہ رہے۔

(انتقاضات شیعہ، ہاشم معروف صفحہ ۴۳)

داؤد مدنی نے امام سجادؑ سے اور آپؑ نے حضرت علیؑ سے روایت بیان فرمائی کہ آپؑ نے فرمایا کہ:

" سرزمین کوفہ میں ایک شخص خروج کرے گا کہ جس کا نام زید ہوگا۔ اس کی عظمت و بزرگی کو نہ گزشتگان پہنچ سکے اور نہ آنے والے پہنچ سکیں گے مگر وہ

شخص جو اس جیسا عمل کرے گا۔ زید اور اس
کے اصحاب جب قیامت کے دن محشور ہوں گے
تو ان کے ساتھ تو امیر ہوں گے اور وہ لوگوں
کے سروں کے اوپر سے گزریں گے. ملائکہ جب ان
سے ملاقات کریں گے تو کہیں گے کہ یہ لوگ خلفِ
صالح ہیں اور حق کی طرف دعوت کرنے والوں میں
سے ہیں. اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ
وسلم ان کے استقبال کو آئیں گے اور فرمائیں گے
کہ اے میرے فرزندو! میں نے جو کچھ امر کیا تم
نے اس پر عمل کیا آج اس کے صلے میں تم بے حساب
جنت میں داخل ہو جاؤ۔"

(انتفاضاتِ شیعہ - ہاشم معروف صفحہ ۳۴)

سدیر صیرفی کہتے ہیں کہ:

" میں امام محمد باقر علیہ السلام کی مجلس میں حاضر تھا کہ حضرت زید ابن علیؑ داخل ہوئے۔ امام محمد باقر علیہ السلام نے اپنا دستِ مبارک زید کے بازو پر رکھ کر فرمایا کہ:

" یہ بنی ہاشم کے سردار و آقا ہیں۔ جب
بھی یہ تمھیں بلائیں تم پہنچو اور جب بھی تم سے مدد
کے خواہاں ہوں ان کی نصرت کرو۔"

(انتفاضاتِ شیعہ، ہاشم معروف صفحہ ۳۴)

مامون الرشید کے دربار میں امام رضا علیہ السلام کے سامنے حضرت

زید شہید کا ذکر آیا تو آپؑ نے فرمایا :

"وہ علمائے آل محمدؐ میں سے تھے۔ وہ خدا کے لیے غضب ناک ہوئے، دشمنِ خدا سے لڑے یہاں تک کہ راہِ خدا میں شہید ہوئے۔"

آپؑ نے اپنے پدر بزرگوار موسیٰ ابن جعفر سے نقل فرمایا کہ آپؑ فرماتے تھے کہ :

"خدا رحمتیں نازل فرمائے میرے چچا زید پر کہ انھوں نے ہماری طرف لوگوں کو دعوت دی۔ اگر وہ کامیاب ہوتے تو ہمارے ساتھ وفاداری کرتے۔"

جب امام جعفر صادق علیہ السلام نے اولاد امام حسنؑ کی شہادت کی خبر سنی تو آپ نے غم وغصہ کا اظہار فرمایا :

"آلِ محمدؐ کی طرف سے طاغوت و آمریت کے خلاف جہاد کرنے والوں میں سے حسین ابن علی ابن حسن ابن حسنؑ ابن علیؑ ابن ابی طالبؑ تھے۔ اس عظیم شخصیت کی عظمت کے لیے کافی ہے کہ جب رسول اکرمؐ وادی فخ سے گزرے کہ جہاں یہ بزرگ شہید ہوئے تو یہاں سرور کائنات نے گریہ کرنے کے بعد فرمایا کہ یہاں ہمارے خاندان سے ایک ہستی ایک گروہ مومنین کے ہمراہ شہید ہوگی۔ ان کے کفن اور حنوط جنت سے نازل ہوں گے اور ان کی روح

ان کے جسد سے پہلے جنت میں داخل ہو گی ۔"

اس کے بعد آپؑ نے فرمایا :

" ان کے ساتھ شہید ہونے والوں کا اجر دوؑ شہیدوں کے برابر ہے ۔"

امام جعفر صادق علیہ السلام بھی حج پر جاتے ہوئے جب یہاں پہنچے تو نماز پڑھنے کے بعد آپؑ نے گریہ فرمایا ۔

راوی نے سوال کیا کہ

" مولا ! کیا یہ اعمالِ حج میں سے ہے ——— ؟ "

آپؑ نے جواب دیا کہ :

" نہیں ——— بلکہ ہمارے خاندان میں سے ایک ہستی ایک گروہ کے ہمراہ یہاں شہید ہو گی جن کی ارواح ان کے جسم سے پہلے جنت میں داخل ہوں گی ۔"

(حیات امام موسیٰ ابن جعفر جلد اوّل صفحہ ۴۶۴
مقاتل طالبین صفحہ ۴۳۷)

حسین فخ نے مدینہ منوّرہ میں مسجد نبویؐ میں خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ :

" میں تمھیں سنتِ رسولؐ کی طرف دعوت دیتا ہوں اے لوگو ! کیا آثار رسول اللہ صلعم کو لکڑی اور پتھر میں ڈھونڈتے ہو اور ان کی ذریت کو ضائع کرتے ہو ۔ جب اس ہستی نے مدینہ منورہ فتح کرنے

کے بعد مکہ کا رُخ کیا اور جب آپ کی وادیٔ فخ
میں لشکر بنی عباس کے ساتھ جنگ ہوئی تو آخر
میں یہ وادیٔ فخ کربلائے حسین فخ بن گئی۔ سو
سے زیادہ بنی ہاشم کے نوجوانوں کے سرہائے مقدس
اور ان کے آگے آگے سرِ مقدس حسین فخ خلیفۂ
عباسی کے دربار میں پہنچے اور امام موسیٰ ابن جعفرؑ
نے جب یہ منظر دیکھا تو بے اختیار "انا للہ وانا الیہ
راجعون" پڑھ کر فرمایا کہ :
خدا کی قسم ! یہ راہ خدا میں صالح اور مسلمان مرے
نماز گزار اور صاحب صوم مرے ۔ امر بالمعروف
اور نہی عن المنکر کرتے ہوئے مرے ۔ ان کے اہلبیت
میں ان جیسی ہستی نہیں ہے ۔"

(حیات امام حسنؑ جلد اول صفحہ ۴۰۷
مقاتل طالبین صفحہ ۴۵۳)

ائمہ اطہار علیہم السلام کا ان ذواتِ مقدسہ کی کہ جنھوں نے طاغوتِ آمریت کے خلاف جہاد کر کے جام شہادت نوش فرمایا، اس لہجہ و انداز میں تعریف فرمانا، ان کی طرف لوگوں کو دعوت دینا، ان کی شہادت پر آنسو بہانا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ ذواتِ مقدسہ ائمہ اطہارؑ سے براہِ راست رابطہ رکھتے تھے۔

اپنے اصحاب کو رازداری کی تاکید

کسی بھی تحریک اور قیام کے سلسلہ میں رازداری اور اسرار پوشی ایک

بنیادی ضرورت ہے۔ اگر قبل از وقت خفیہ منصوبوں سے متعلق اسرار فاش ہو جائیں تو نہ صرف منصوبے ناکام ہو جاتے ہیں بلکہ ان منصوبوں کے پیچھے کارفرما عوامل بھی ضرر اور نقصان کا شکار ہو جاتے ہیں۔

ائمہ طاہرینؑ سے وارده احادیث و روایات میں ایک سلسلہ ایسا بھی ملتا ہے جس میں ائمہؑ اپنے اصحاب کو رازداری کی تاکید کرتے اور اسرار پوشی کے سلسلہ میں متنبہ کرتے نظر آتے ہیں۔

رازداری اور اسرار پوشی کی یہ تاکید اس بات کی جانب روشن اشارہ ہے کہ آپ کچھ معاملات کو عام لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ رکھنا چاہتے ہیں اور نہیں چاہتے کہ غیر متعلقہ افراد ان رازوں سے واقف ہو کر آپؑ اور آپ کے اصحاب کے لیے ضرر و نقصان کا باعث بنیں۔

آیا رازداری کی یہ تاکید جیسے کہ خود ان کے الفاظ اور لب و لہجہ سے بھی ظاہر ہے قیام اور انقلاب کی منصوبہ بندی کے علاوہ کسی اور سلسلہ میں ہو سکتی ہے؟

رازداری کے سلسلہ میں روایات کے چند نمونے ملاحظہ فرمائیں:

امام جعفر صادقؑ ارشاد فرماتے ہیں:

"واللہ اگر تمھاری زبانوں پر کوئی غلاف ہوتا تو میں تم میں سے ہر شخص کو وہ بات بتاتا۔ واللہ اگر مجھے صاحب تقویٰ لوگ ملتے تو میں گفتگو کرتا۔"

(قصار الجمل۔ جلد۲ صفحہ ۱۷۶)

امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ:

"مجھے کوئی ایسا شخص نہیں ملتا کہ جس سے میں (راز کی) بات کر سکوں۔ اگر میں تم میں سے کسی

سے کوئی بات کروں تو یہ بات اس کے مدینہ سے
نکلنے سے پہلے ہی فاش ہو جائے گی۔"

(قصار الجمل جلد دوم صفحہ ۱۷۶
بحار الانوار جلد دوم صفحہ ۲۱۳)

حضرت امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ:
" ہمارے اسرار پوشیدہ رہے یہاں تک کہ وہ
اولادِ کیسان تک پہنچے، جنھوں نے ان کو راستوں
اور بازاروں میں طشت از بام کیا۔"

(قصار الجمل جلد دوم صفحہ ۱۷۸
بحار الانوار جلد ۷۵ صفحہ ۷۶)

امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ:
" اپنی زبان کو محفوظ رکھو اور اپنے گھروں میں بیٹھو
تمھیں کوئی خاص مصیبت نہیں پہنچے گی اور زیدیہ
ہمیشہ تمھارے بچاؤ کا سبب بنیں گے۔"

(قصار الجمل جلد دوم۔ صفحہ ۱۷۸
بحار الانوار جلد ۷۵۔ صفحہ ۸۴)

اسرار فاش کرنے کی مذمت

امام سجاد علیہ السلام نے فرمایا کہ:
" واللہ! مجھے اپنے بازوؤں کا گوشت کاٹا جانا
اس امر سے کہیں زیادہ پسند ہے کہ میرے اصحاب

میں یہ دو خصلتیں پائی جائیں۔ ایک نزق اور
دوسری قلتِ کتمان۔"

(قصار الجمل جلد دوم صفحہ ۱۷۷
بحارالانوار جلد ۷۵۔ صفحہ ۶۹)

امام صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ:
"جو شخص ہمارے اسرار کو فاش کرتا ہے وہ
ہمارے حق کا منکر ہے۔"

(قصار الجمل جلد دوم صفحہ ۱۷۸
وسائل الشیعہ)

امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ:
"ہماری حدیث کو فاش کرنے والے ہمارے
منکر ہیں۔"

(قصار الجمل جلد دوم صفحہ ۱۷۸)

امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ:
"جو ہماری حدیث کو فاش کرے خداوندِ عالم نے اس
سے ایمان کو سلب کر لیا۔"

(قصار الجمل۔ جلد دوم۔ صفحہ ۱۷۸)

امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ:
"جس نے ہماری حدیث کو فاش کیا گویا اس نے ہم
کو (غلطی) خطا سے نہیں بلکہ عمداً قتل کیا۔"

(قصار الجمل۔ جلد دوم۔ صفحہ ۱۷۸)

امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ :
" ہمارے اسرار فاش کرنے والے ایسے
ہی ہیں جیسے ہم پر تلوار اٹھانے والے ۔"

امام صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ :
" ہمارے اسرار فاش کرنے والے ہمارے
قاتل سے زیادہ گنہگار ہیں ، گنہگار ہیں،
گنہگار ہیں ۔"

ذرا غور فرمائیے کہ وہ کون سے اسرار ہیں کہ جن کے افشا کی مذمت میں امامؑ اتنا سخت لب ولہجہ اختیار فرماتے ہیں ؟

کیا وہ مبدا، اور معاد سے متعلق یا حلال وحرام سے متعلق مسائل ہیں ـــــــ ؟

ان مسائل کی تبلیغ وتشریح تو امامؑ پر واجب ہے۔ پھر وہ کون سے امور ہیں جن کے فاش ہونے سے امامؑ کو خطرہ لاحق ہے ـــ ؟ غور فرمائیے !

تقیہ

گو کہ تقیہ کے موضوع پر گفتگو دور حاضر کے انقلابی نوجوانوں کے لیے ذہنی کوفت کا باعث ہے اور وہ تقیہ کا لفظ سننے کے ہی روادار نہیں کیونکہ ظلم وستم کی بنا پر ان کا پیمانہ صبر لبریز ہو چکا ہے اس لیے ایک لحاظ سے وہ اس

میں حق بجانب بھی ہیں ۔

لیکن اگر ہم ائمہ طاہرینؑ کی زندگیوں پر نظر ڈالیں تو دیکھتے ہیں کہ ائمہؑ ظالموں سے کھلم کھلا جہاد اور مجاہدین کی سرپرستی و غمخواری کے ساتھ ساتھ، اپنے پیروکاروں کو تقیہ کی تعلیم و تلقین کرتے ہوئے بھی نظر آتے ہیں۔ اس بنا پر وہ لوگ جو تقیہ کے حقیقی مفہوم سے ناآشنا ہیں ان کے ذہنوں میں شکوک و شبہات پیدا ہوتے ہیں ۔

ائمہ طاہرینؑ کی تقیہ کی تلقین و تاکید امتِ اسلامی کے عظیم تر مفاد میں تھی ۔ ہمارے یہ پیشوا امت کے درمیان عمومی اختلاف و انتشار کے قائل نہ تھے ۔ بلکہ چاہتے تھے کہ امت یک نوع و یک رنگ ہوکر اتحاد و اتفاق کے ساتھ ظالموں کے مقابلے کے لیے جمع ہو۔

اور اسی کے ساتھ ساتھ اس بات کے لیے کاوش و کوشش میں مصروف تھے کہ اولاً ایک راسخ العقیدہ اور اسلام و حق شناس گروہ تیار کیا جائے اور ثانیاً اس راسخ العقیدہ گروہ کے افراد کی جانوں کے تحفظ اور ضیاں کو روکنے کی غرض سے تقیہ کی نہایت تاکید و تلقین کرتے تھے ۔

یہاں بے جا نہ ہوگا اگر مختصر الفاظ میں تقیہ کے مفہوم پر روشنی ڈالیں۔

مفہومِ تقیہ

"تقیہ" عربی کے لفظ " وقیٰ " "یقیٰ" سے ماخوذ ہے جس کا معنیٰ ہے بچاؤ اور تحفظ ۔

شرعی اصطلاح میں " تقیہ " قول و فعل کے ذریعہ کسی دوسرے کی موافقت کا اظہار کر کے اس کے ضرر سے بچنے کو کہتے ہیں ۔

تقیہ کے تین مدارج ہیں :

۱۔تقیہ فردی

جب ضرر اور نقصان کا خطرہ کسی خاص فرد کو لاحق ہو۔ چاہے وہ ضرر مالی ہو یا جانی یا عرضِ ناموس کا۔

چنانچہ شریعتِ اسلام نے ایسے شخص کو اس کی جان و مال یا عرضِ ناموس کے تحفظ کے لیے ـــــ اپنے معین شدہ عقائد یا اعمال کو خلاف واقعہ پیش کرنے کی اجازت دی ہے۔

۲۔تقیہ اجتماعی

کبھی تقیہ نہ کرنے کی صورت میں اس شخص کی ذات کے لیے خود تو کوئی ضرر کا احتمال نہیں ہوتا لیکن اس کے ترک تقیہ سے معاشرے کے دوسرے افراد کو یہ ضرر پہنچتا ہے۔

معاشرے کے افراد کو ضرر سے بچانے کے لیے ائمہ اطہارؑ کی مثال ہمارے پاس موجود ہے چنانچہ ائمہ اطہارؑ کبھی کبھی اپنے مخلص اصحاب کے بارے میں برأت کا اظہار کرتے تھے تاکہ ان کی جان بچ جائے۔ اگرچہ حقیقتاً وہ دل سے ان سے محبت کرتے تھے۔

۳۔تقیہ سیاسی

کبھی ترک تقیہ سے ضرر اور نقصان صرف تقیہ نہ کرنے والے اور افراد معاشرہ ہی کو نہیں ہوتا بلکہ پوری ملتِ اسلامیہ اور بیضۂ اسلام اس ضرر کی لپیٹ

میں آجاتے ہیں۔

اسلام جبکہ فرد خاص کی جان و مال اور آبرو کے تحفظ کے لیے تقیہ کی تاکید کرتا ہو، جہاں ائمہ اطہارؑ جیسی ہستیاں اسلامی معاشرے کے چند افراد کی جان بچانے کے لیے تقیہ کرتی ہوں کیا وہاں بیضۂ اسلام اور پوری امتِ اسلامیہ کے تحفظ کے لیے تقیہ کی اجازت نہ ہوگی؟

آج کے دور میں اگرچہ تقیہ فردی یا تقیہ اجتماعی کی نوبت کم ہو یا بالکل نہ ہو لیکن حفاظت بیضۂ اسلام اور تحفظ ملتِ اسلامیہ کے لیے تقیہ سیاسی کا یقیناً یہ عین موقع ہے اور محل تقیہ ہے۔

آج کل مشرق اور مغرب کے الحاد و استعمار کی بیضۂ اسلام اور ملتِ اسلامیہ پر جو یلغار ہے اس کا احساس کرنے والی واحد شخصیت، مشرق و مغرب کے اور استعمار و استکبار کے تبوں کو توڑنے والی، خمینیؒ بت شکن کی ہستی ہے۔

آپ نے انتہائی کمالِ جرأت و شجاعت کے ساتھ تاریخ ساز فتاویٰ صادر فرمائے۔ مثلاً آپ نے فرمایا کہ:

> "دنیا بھر سے آنیوالے شیعہ حجاج کو چاہیے کہ وہ اپنے مکہ اور مدینہ میں قیام کے دوران نہ صرف یہ کہ حرمین شریفین میں فرادیٰ نماز نہ پڑھیں بلکہ وہاں اپنی قیام گاہوں پر بھی انھیں اقامتِ جماعت سے سختی سے منع کرتے ہوئے تاکید فرمائی کہ وہاں ان کے لیے ضروری اور واجب ہے کہ وہ اماین حرمین کے زیر اقتدا نماز ادا کریں اور اتحاد و اتفاق کا مظاہرہ کرکے مشرق و مغرب کے چیلنج کا جواب دیں۔"

اگر اس کی سند اور حوالہ کی ضرورت ہو تو امام خمینی رضوان اللہ علیہ کے مناسک حج کی طرف رجوع فرمائیں۔

زیر نظر کتاب میں اتنی گنجائش نہیں کہ فلسفۂ تقیہ اور مسائل تقیہ پر تفصیلی بحث کی جائے البتہ تقیہ کے معنی و مفہوم اور مصادیق بیان کر دینے کے بعد ہم قارئین کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ ائمہ اطہارؑ کے ان اقدامات کو ملاحظہ فرمائیں کہ اس وقت مملکت اسلامی کو لاحق خطرات سے بچانے کے لیے کس طرح انھوں نے وحدت و اتفاق کا مظاہرہ فرمایا یہ واقعات تاریخ کے صفحات پر محفوظ ہیں۔

ہم یہاں بطور نمونہ دو تاریخی شواہد پیش کرتے ہیں۔

(۱) —— صحیفۂ سجادیہ میں امام سجادؑ کی ایک دعا دعائے اہل ثغور کے نام سے بہت معروف ہے۔ آپؑ یہ دعا اس وقت کی مملکت اسلامی کی سرحدوں کے محافظوں کے حق میں فرماتے تھے اور دوسروں کو اس دعا کی تلاوت کا حکم دیتے تھے۔ آپ جانتے ہیں کہ اسلامی سرحدوں کی یہ محافظ فوج کون سی فوج تھی ؟

کیا یہ ائمہؑ کی تیار کردہ فوج تھی ؟ نہیں ! بلکہ یہ انھیں حکام اور ظالمین کی فوج تھی جنھوں نے سید سجاد کے پدر بزرگوار حسین بن علی علیہ السلام اور خاندانِ بنی ہاشم کی بے مثل اور بے نظیر ہستیوں اور اصحاب و انصار کو شہید کر کے ان کے خیموں کو لوٹ کر مخدراتِ عصمت و

طہارت کو بازاروں اور درباروں میں پھرایا اور خود سید سجادؑ کی گردن میں طوق اور ہاتھوں میں زنجیریں پہنا کر اسیر کر کے کربلا سے کوفہ اور کوفہ سے شام لے گئے۔

(۲) ——— عبدالملک بن مروان کے دورِ خلافت میں رائج سکے سے متعلق حکومت روم کی طرف سے اسلامی اقتصاد کو چیلنج کیا گیا تو امام محمد باقر علیہ السلام نے خلیفۂ وقت کو اسلامی سکے کے اجرار کے لیے ہدایت فرما کر مملکت اسلامی کو مسیحیت کے خطرے سے بچایا۔

ائمہ اطہارؑ نے تقیہ کے بارے میں بڑے شدید لہجہ میں تاکید فرمائی ہے چنانچہ امام جعفر صادق علیہ الصلوات والسلام فرماتے ہیں کہ:

"جو تقیہ نہیں کرتے وہ دین نہیں رکھتے۔"

اسی طرح آپؑ نے فرمایا کہ:

"تقیہ میرا اور میرے آبا و اجداد کا دین ہے۔"

(وسائلِ امام خمینی جلد دوم صفحہ ۱۷۶)

ائمہ اطہارؑ کا اس انداز میں اپنے ماننے والوں کو تقیہ کرنے کا حکم اور تقیہ ترک کرنے کی مذمت کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ جہاں آپؑ زہد و عبادت اور راز و نیاز میں مصروفِ عمل تھے وہاں آپ مملکتِ اسلامی اور قیامِ عدل کے خواہاں تھے۔ کیونکہ خلوت میں معاشرہ سے منزوی (گوشہ نشینی) میں رہ کر راز و نیاز کسی بھی قسم کے خطرے کا سبب نہیں بن سکتا۔

خطرہ اس وقت لاحق ہوتا ہے جب یہ عمل دوسروں کے مفادات کے لیے چیلنج ہو۔

حکومتوں کا ائمہ اطہارؑ کو گرفتار کرنا، ان کو نظر بند رکھنا، ان کے گھروں کی تلاشی لینا اور انکے اعمال و افعال کی نگرانی کرنا

اپنے دور کے حکمرانوں کے خلاف ائمہ طاہرینؑ کے سرگرم ہونے اور ان حکومتوں کے خلاف کام کرنے کی ایک اور دلیل حکمرانوں کا آپ حضرات سے وہ رویہ ہے جس کے تحت وہ آپ علیہم السلام کی حرکات و سکنات پر نظر رکھتے، آپؑ کے گھروں کی تلاشی لیتے تھے اور آپؑ کو قید کرتے تھے۔

اس سلسلہ میں چند تاریخی شواہد ملاحظہ فرمائیں:

○ —— فضل ابن ربیع کہتے ہیں کہ منصور دوانیقی ۱۴۷ھ ہجری میں حج سے واپسی پر مدینہ گیا۔ مدینہ پہنچنے کے بعد مجھ سے کہا کہ فوراً ایک آدمی کو روانہ کرو کہ وہ جعفر ابن محمد کو وہ جس حال میں بھی ہوں گرفتار کر کے لائے اور کہا کہ:

"خدا مجھے قتل کرے اگر میں اسے قتل نہ کروں۔"

فضل بن ربیع کہتے ہیں میں نے اس میں تساہل کیا تا کہ وہ اس بات کو بھول جائے۔ منصور نے پھر اپنے اسی حکم کی تاکید کی۔ اور فضل بن ربیع نے پھر ایک مرتبہ تساہل کیا۔ تیسری مرتبہ منصور نے فضل ابن ربیع کو سب وشتم کرتے ہوئے سختی سے کہا کہ جعفر ابن محمد کو گرفتار کر کے لاؤ۔ فضل ابن ربیع کہتے ہیں کہ میں امامؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ:

"مولا! خدا کو یاد کریں۔ مجھے ایسے مقصد کے لیے آپؑ کے پاس بھیجا گیا ہے کہ جس کو خدا کے سوا کوئی اور دفع نہیں کر سکتا۔"

امامؑ نے کلمہ لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ اِلَّابِاللّٰہ پڑھا اور فضل ابن ربیع کے ساتھ منصور کے دربار میں گئے۔ جب دروازے پر پہنچے تو فضل ابن ربیع نے منصور کو آگاہ کیا کہ میں امامؑ کو لے کر آگیا ہوں۔ منصور نے امامؑ سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ:

"اے دشمن خدا! اہلِ عراق نے تمھیں اپنا امام بنایا ہے اور ان کے اموال اور زکوٰۃ تمھارے پاس جمع ہو رہے ہیں اور تم ہماری حکومت کے مخالف ہو اور کوئی بہانہ ڈھونڈ رہے ہو خدا مجھے قتل کرے اگر میں تمھیں قتل نہ کروں۔" امامؑ نے جواب میں فرمایا کہ: "اے خلیفہ! خدا نے سلیمانؑ کو حکومت دی تو انھوں نے شکر کیا اور ایوبؑ کو بیماری میں مبتلا کیا تو انھوں نے صبر کیا۔" امامؑ کا اتنا کہنا تھا کہ منصور نے امامؑ کو اپنی مسند کے قریب بلایا۔ امامؑ کے حق میں دعا کی اور فضل ابن ربیع سے کہا کہ: "جعفر صادقؑ کو تحفہ و تحائف کے ساتھ ان کے گھر پہنچا دو۔"

(کشف الغمہ جلد دوم صفحہ ۴۰۷ اور ۴۲۸)

منصور دوانیقی کہتا ہے کہ:

"امام جعفر صادقؑ میرے لیے گلے میں پھنسنے والی ہڈی ہیں۔"



دوسری شخصیت جسے گرفتار کیا گیا وہ امام ہفتم امام موسیٰ کاظم سلام اللہ علیہ کی ذات گرامی تھی۔ امامؑ کی ذات ہارون الرشید کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتی تھی۔ وہ ہارون الرشید کہ جو کہتا تھا کہ بادل جہاں تک بھی جائیں میری حکومت

سے باہر نہیں جا سکتے۔ یہی ہارون مدینہ میں آکر قبر رسولؐ کے پاس انتہائی بے شرمی سے روضۂ رسولؐ سے خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ:

"میں آپ سے اس امر کی بابت معذرت چاہتا ہوں کہ جس کا میں نے ارادہ کیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ امام موسیٰ کاظمؑ کو قید کروں کیونکہ مجھے ڈر ہے کہ وہ آپ کی امت میں ایک جنگ چھیڑیں گے جس میں خون بہے گا۔"

اس کے بعد اس نے امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کو گرفتار کر کے اپنے لشکر کی حفاظت میں بصرہ کی طرف روانہ کیا۔"

(حیاتِ موسیٰ ابن جعفرؑ جلد دوم صفحہ ۴۶۴

نقل از بحار الانوار جلد ۱۷ صفحہ ۲۹۶)

اسی طرح امامؑ کو ایک زندان سے دوسرے زندان میں منتقل کرتے ہوئے بقول مشہور، چودہ سال تک زندان اور شہر بندی میں رکھا۔

○ تیسری شخصیت، امام علیؑ ابن موسیٰ الرضا کی ذات ہے۔ اگرچہ آپؑ کو ظاہری طور پر قید تو نہیں کیا گیا لیکن مامون نے اپنے ناپاک سیاسی عزائم کے تحت ایک لحاظ سے اس وقت کے علوی خاندان کے طاغوت کے خلاف ہونے والی مزاحمتی تحریک کے مقابلے میں امامؑ کو سپر بنا کر ان تحریکوں کو بے اثر بنانا چاہا۔ دوسری طرف ولیعہدی پیش کر کے امامؑ کو اپنے شیعوں اور موالیان سے دور اور حکومت کی نگرانی میں رکھا۔ اس پر

بھی وہ قانع نہ ہوا بلکہ اپنی بیٹی کو امامؑ کے عقد میں دے کر امامؑ کی روزمرّہ کی نقل وحرکت سے آگاہ رہنے کی ناپاک کوشش کی۔ آخر کار امامؑ کو زہر دے کر اس چراغِ ہدایت کو گل کر دیا۔

چوتھی شخصیت عظیم امامِ نہم حضرت امام جواد علیہ السلام کی ہے۔ امام محمد جوادؑ دس سال کی عمر میں امام رضاؑ کی شہادت کے بعد مسند امامت پر فائز ہوئے۔ آپ کو فوراً مامون الرشید نے بغداد میں طلب کیا اور امامؑ کی نقل وحرکت کو زیرِ نظر رکھنے کی نیت سے اپنی بیٹی ام الفضل کو امامؑ کے عقد میں دے دیا۔ اگرچہ مامون نے امامؑ کو مدینہ واپس جانے کی اجازت دی۔ لیکن مختصر عرصہ میں ہی معتصم عباسی نے امامؑ کو دوبارہ بغداد میں طلب کر کے شہر بند رکھا۔ آخر میں معتصم عباسی نے آپؑ کو شہید کرایا۔

پانچویں شخصیت امام دہم حضرت علی ہادیؑ کی شخصیت ہے آپؑ اپنے پدر بزرگوار کی شہادت کے بعد مدینۂ منورہ میں مصروف عمل تھے اور وہاں شیعیانِ علیؑ کے مرکز و ماویٰ تھے۔ جب حکومت عباسی کے محافظ کارنے امام کے پاس لوگوں کی آمد ورفت دیکھی تو تاب صبر نہ لاکر متوکل خلیفہ بنی عباس کو لکھا کہ اگر تم حرمین شریفین کی احتیاج رکھتے ہو تو جلد از جلد علی ہادیؑ کو یہاں سے نکال دو کیونکہ انھوں نے لوگوں کو اپنی طرف بلایا ہے اور بہت سے لوگ ان کے تابع بن چکے ہیں اس خط کے نتیجہ میں متوکل عباسی نے بظاہر شفقت و مہربانی کے

ساتھ لیکن باطن میں کینہ وحسد کے ساتھ امامؑ کو سامرہ بلایا، اور آپؑ کی نقل وحرکت پر کڑی نظر رکھی ۔جب امامؑ سامرہ پہنچے تو آپؑ کو دربار میں آنے کی اجازت نہ ملی اور نہ ہی رہنے کو کوئی دوسری جگہ ملی ۔ رہنے کو کوئی جگہ نہ ملنے کی وجہ سے آپؑ نے خانۂ صعالیک (مسکنِ فقرا نشین) میں رات گزاری دوسرے دن جب آپؑ دربار میں داخل ہوئے تو متوکل اپنی منافقت کو چھپاتے ہوئے امامؑ کے ساتھ احترام واکرام سے پیش آیا اور ان پر کڑی نظر رکھنے کی نیت سے آپؑ کی رہائش کا بندوبست کیا اور اپنے ناپاک عزائم کو چھپائے رکھا۔ یہاں تک کہ تابِ صبر نہ لا کر رات کے سناٹے میں، دین ومذہب سے نا آشنا ترکوں کی ایک جماعت کو امامؑ کی رہائش گاہ کی تلاشی لینے کا حکم صادر کیا۔ اس جماعت نے تلاشی لینے کے بعد امامؑ کو جس حالت میں وہ گھر میں تشریف فرما تھے، اسی حالت میں گرفتار کرکے دربار میں دوبارہ حاضر کیا۔ یہاں تک کہ وہ بار بار امامؑ کو گرفتار کرکے دربار میں پیش کرتے تھے ۔ آخر کار معتمد عباسی نے آپ کو زہر سے شہید کر دیا۔

○ —— چھٹی شخصیت امام حسن عسکری علیہ السلام کی ذاتِ گرامی تھی کہ جس کو بنی عباس کے حکام نے کبھی سامرہ میں نظر بند رکھا اور کبھی زندان کی قید وبند میں رکھا۔

یہ تھے ائمہ اطہارؑ پر ہونے والی سخت نگرانی اور ان کے قید وبند میں رکھے جانے کے چند تاریخی حقائق جو سیرتِ ائمہ سے متعلق کسی بھی کتاب میں ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں۔

لہٰذا ہم نے ان کے حوالہ جات لکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اگرچہ مختصراً ہم نے واقعاتِ کربلا کو کتاب ائمۂ اثنا عشر، تالیف ہاشم معروف حسنی سے نقل کیا ہے۔

ان حقائق کی روشنی میں چند گزارشات آپ کی خدمت میں پیش کی جاتی ہیں:

طاغوت و آمریت اپنی نامشروع اور غیر قانونی حکومت کی بقا اور دوام کے لیے ہر وہ کوشش اپنانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتی جو اس کے امکان و قدرت میں ہو۔ اس کا یہ نظریہ اور ایمان ہے کہ ہر وہ وسیلہ اور ہر وہ ذریعہ جو حکومت کی بقا اور دوام کے لیے ممد و معاون ہو اس سے استفادہ کرنا نہ صرف جائز ہے بلکہ وہ اسے ضروری اور لازمی سمجھتے ہیں چاہے وہ غیر شرعی ہو اور چاہے وہ مثل حرام ہو۔

اس سلسلہ میں وہ کثیر اموال رشوت میں دیکر لوگوں کے ضمیروں اور مدح سرائی کرنے والوں کو خریدتے ہیں اور اپنے مخالفین کو جیل کی تاریکی میں رکھ کر یا پھر سولی پر چڑھا کر ہر آواز کو خاموش کر دیتے ہیں۔ تاکہ لوگوں کو مرعوب اور خوف زدہ رکھیں۔

لہٰذا طاغوت اور آمریت کسی صورت میں بھی کسی ایسے کام کو انجام دینے کے لیے تیار اور آمادہ نہیں ہوتی جس کا نتیجہ ان کی حکومت کے لیے ایک چیلنج اور خطرہ کا باعث ہو، وہ ایسے کاموں کو کہ جن کے بارے میں یقینی ہونا تو کجا ذرہ برابر وہم و گمان بھی ہو کہ وہ ان کی حکومت و اقتدار کے لیے ضرر رساں ہوگا تو اسے نہیں اپناتے۔

ان حقائق کی روشنی میں یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ اگر ائمہ اطہارؑ ایسے کاموں میں مصروفِ عمل نہ ہوتے جو ان طاغوتی حکومتوں کے لیے باعثِ خطر ہوں تو ظاہر ہے کہ وہ حکومتیں انھیں اذیت پہنچانے کا خطرہ کبھی مول نہ لیتیں کیونکہ عوام ان ذوات مقدسہ سے ایک عقیدت اور دلی لگاؤ رکھتے تھے اور حکومت کے لیے ان ذوات سے معترض ہونا ایک ملت کی ناراضگی اور دشمنی مول لینے کے مترادف تھا۔

ائمہ طاہرینؑ نے امت کو ظالم اور مستبد حکمرانوں کے خلاف بیدار کرنے اور امت اور اہلبیت علیہم السلام کے درمیان عمیق تمسک کی خاطر جو اقدامات کیے ان میں عزاداریٔ امام حسینؑ کی تشویق اور قبور ائمہؑ کی زیارت کی تاکید کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

ذیل میں ہم ان دونوں موضوعات پر مختصر الفاظ میں اظہار خیال کریں گے۔

عزاداری کی تشویق دلانا

ظلم و ستم، فسق و فجور اور مستبد حکمرانوں کے خلاف کی جانے والی جد وجہد اور برپا کیے جانے والے معرکوں میں واقعہ کربلا، سب سے زیادہ نمایاں، ممتاز اور ارفع مقام کا حامل ہے۔

کربلا ایک ایسا مکتب ہے جس کے پیروؤں نے کبھی ظلم و ستم کے ساتھ سمجھوتہ نہیں کیا۔ اور ہمیشہ ظلم و ستم اور استبداد و استحصال کے خلاف علمِ جہاد بلند کیا اور اس راہ میں عظیم قربانیوں کا نذرانہ پیش کیا۔

مکتبِ حسینؑ کی اسی تاثیر کی بنا پر ائمہ طاہرینؑ نے اس کی اہمیت کو کبھی فروگزاشت نہیں کیا اور ظلم و فساد اور آمریت و طواغیت کے خلاف اپنے قیام کے استمرار کے لیے ہمہ وقت اس واقعہ کے اصل محرکات و پس منظر اور امام حسینؑ کی قربانیوں اور اہلبیتِ امامؑ پر روا رکھے گئے مظالم کا تذکرہ فرماتے رہے اور لوگوں کو اس واقعہ کی یاد منانے کی مسلسل تاکید کرتے رہے تاکہ لوگ امامؑ کی قربانی سے درس حاصل کر کے ظلم و ستم اور فسق و فجور کے خلاف جنگ پر آمادہ و تیار رہیں۔

ائمہ اطہارؑ نے امام حسین علیہ السلام پر خصوصاً اور تمام اہلبیت اطہارؑ پر پڑنے والے مصائب پر عموماً اپنے ماننے والوں کو مرثیے، نوحے اور اشعار کی صورت میں گریہ و زاری کرنے کی تشویق دلائی ہے تاکہ ان مصائب کو زندہ رکھا جائے۔ اس کی چند مثالیں یہ ہیں:

(۱) ——— شاعر اہلبیت کمیت اسدی سے مخاطب ہوکر امام سجادؑ نے فرمایا کہ:

"اے کمیت! ہم تمھارے ان اشعار کا ثواب واجر دینے سے قاصر ہیں۔"

تو کمیت نے عرض کی کہ:

"مولا! آپ تو مجھ پر بس اتنا احسان فرمائیں کہ اپنے جسم اطہر سے ملے ہوئے لباس کو بطور تبرک مجھے مرحمت فرمادیں۔"

(۲) ——— امام محمد باقر علیہ السلام نے کمیت سے ایک مرتبہ فرمائش کی کہ وہ کوئی شعر سنائے۔ کمیت نے امام حسینؑ کی مصیبت پر شعر پڑھا تو امامؑ نے کمیت کو ایک ہزار دینار اور ایک کپڑا عنایت فرمایا۔ کمیت نے عرض کی:

"مولا! خدا کی قسم! میں نے دنیوی فائدے کی خاطر امام مظلومؑ کی مصیبت پر آپؑ کے سامنے شعر نہیں پڑھا۔ اگر میں دنیا چاہتا تو ان دنیاداروں کے پاس جاتا کہ آج جن کے ہاتھوں میں دنیا ہے۔ میں نے تو آخرت کے اجر کے پیش نظر آپ کی فرمائش کی تعمیل میں شعر کہا۔"

یہ کہہ کر کمیت نے رقم تو امامؑ کی خدمت میں واپس کر دی۔

البتہ لباس کو تبرک کے طور پر قبول کر لیا۔
امامؑ نے فرمایا کہ اے کمیت! جب تک تمھاری زبان ہماری نصرت میں چلتی رہے گی اس وقت تک روح القدس کی تمھیں تائید حاصل رہے گی۔

(۳) شاعرِ اہل بیت دعبل خزاعی، امام رضا علیہ السلام کی ولی عہدی کے دور میں امامؑ کی خدمت میں شرف یاب ہوئے اور ایک شعر کہا جس کے ابتدائی مصرعہ کا مضمون یوں ہے:
"وہ مدرسے جہاں آیاتِ قرآنی کی تلاوت ہوتی تھی اب خالی ہیں۔ وحیٔ الٰہی نازل ہونے والی منزلیں اب غیر آباد ہیں۔"
یہ اشعار سُن کر امامؑ نے اور امامؑ کے اہلِ حرم نے بہت گریہ کیا۔ امامؑ نے اپنے اسمِ گرامی سے رائج شدہ سکّوں میں سے دس ہزار درہم دعبل خزاعی کو عنایت فرمائے اور اس کے علاوہ اپنا جبہ اتار کر دعبل کو مرحمت فرمایا۔ یہ جبہ اس کے عراق روانہ ہوتے وقت اہل قم نے دعبل سے ایک ہزار دینار میں خریدا۔

(۴) امام محمد باقر علیہ السلام نے دنیا سے رخصت ہوتے وقت وصیت فرمائی کہ ان کے خالص مال سے آٹھ سو درہم دیے جائیں اور حج کے موقع پر منیٰ میں ان کے غم میں دس سال تک صفِ ماتم بچھائی جائے اور یہ رقم اس پر صرف کی جائے۔ (رجاب ائمہ جلد چہارم صفحہ ۲۸)

زیارتِ قبور ائمہ علیہم السلام کی تاکید

عزاداری کی تشویق و تاکید کے ساتھ ساتھ ائمہ طاہرینؑ نے اپنے پیروؤں کو اپنے مقاصد سے ہم آہنگ کرنے اور ان کے قلوب میں ائمہؑ سے گہری وابستگی قائم کرنے کے لیے زیارتِ قبور ائمہؑ کی بھی تاکید فرمائی اور خصوصاً امام حسین علیہ السلام کی قبرِ مطہر کی زیارت پر خاص توجہ دلائی۔ زیارتِ حرم حسینیؑ کی راہ میں اٹھائی جانے والی تکالیف و مشکلات کے عوض بے انتہا اجر و ثوابِ آخرت کی نوید بھی اسی تشویق و تاکید کے زمرے میں آتی ہے۔

زیارت سے مراد اگرچہ ائمہ اطہارؑ کی قبور مقدسہ پر حاضری دینا ہے۔ لیکن افضل و اشرف یہ ہے کہ ان زیارات کو پڑھ کر امامؑ کو خطاب کریں کہ جو زیارات خود ائمہ اطہارؑ سے کتب زیارات میں مروی ہیں۔

اس ضمن میں ہم زیارات سے متعلق چند نکات پیش کرنا چاہتے ہیں تاکہ آپ خود اس کے بارے میں تجزیہ و تحلیل کریں کہ ائمہ اطہار علیہم السلام کا لوگوں کو اپنی قبور کی طرف دعوت دینے کا تنہا اور واحد مقصد ایک سعادت یا ایک رابطہ قائم کرنا اور ایک خاص ولایت و محبت کا مظاہرہ کرنا نہیں ہے بلکہ ان زیارات کے پس پردہ ائمہ اطہارؑ کے پیش نظر بہت سے مقاصد و اہداف تھے۔ ہم اس بحث کو چند نکات پر محمول کرتے ہیں:

(۱) فضائلِ زیارت

○ معصوم فرماتے ہیں کہ:

"جس نے امام حسین علیہ السلام کی زیارت کی گویا

اس نے عرش پر خدا کی زیارت کی۔"

○ ــــ امام حسین علیہ السلام کی زیارت کے جو اجر و ثواب بیان کیے گئے ہیں وہ اتنے ہیں کہ جتنا ایک حج مقبول کا ثواب ــــ ایک حج و عمرے کا ثواب ــــ تین حج کا ثواب ــــ دس حج کا ثواب ــــ بیس حج اور بیس عمرے کا ثواب ــــ بیس حج سے افضل ــــ اکیس حج ــــ بائیس حج ــــ پچیس حج ــــ تیس حج ــــ پچاس حج ــــ ستّر حج ــــ اسّی حج ــــ نوّے حج ــــ سو حج ــــ سو حج اور سو عمرے ــــ ہزار حج اور ہزار عمرے ــــ دو ہزار حج اور دو ہزار عمرے ــــ امامِ زمانہؑ کی معیت میں ایک لاکھ حج ــــ اور ــــ رسول اکرمؐ اور باقی ائمہؑ کی معیت میں ایک لاکھ حج کے ثواب کے برابر ہے۔

○ ــــ زیارت امام حسین علیہ السلام کے لیے اٹھائے جانے والے ہر قدم اور زمین پر رکھے جانے والے ہر قدم کے لیے سو حج اور سو عمرے کا ثواب ہے۔

○ ــــ زیارت امام حسین علیہ السلام کے ثواب کے بارے میں معصومؑ فرماتے ہیں کہ:

"اس کے اجر و ثواب کا حساب عقلِ بشر کی حد سے باہر ہے اور خدا ہی اس کا حساب کرسکتا ہے۔"

البتہ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ یہ تمام اجر و ثواب جو زیارتِ امام حسین علیہ السلام کے سلسلے میں مروی ہیں اس کے ہرگز یہ معنی نہیں کہ

حج واجب کو ترک کیا جا سکتا ہے۔ یہ اجر و ثواب واجب حج کی کفایت نہیں کرتے۔ چنانچہ ابی سعید قماط نے یسار سے اور انھوں نے امام جعفر صادق ؑ سے دریافت کیا کہ :

" کیا زیارتِ امام حسین علیہ السلام واجب حج کی کفایت کرتی ہے ـــــــ ؟ "

امام ؑ نے فرمایا کہ :

" نہیں ـــــــ !

ہم یہ نہیں کہتے بلکہ ہماری مراد (اس اجر و ثواب کا مصداق) وہ شخص ہے جو حجۃ الاسلام واجب حج بجا لایا ہو۔ "

صاحبانِ فکر و شعور اور اہل دانش کے لیے مقام فکر ہے کہ ائمہ اطہار ؑ کہ جن کے متعلق مبالغہ آمیزی اور تضاد گوئی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کیونکر ممکن ہے کہ وہ پاک و منزہ ہستیاں زیارتِ امام حسین ؑ کی فضیلت کے بیان میں اس حد تک چلی جائیں اور اس کے اجر و ثواب کی حد کو ایک حج کے ثواب سے لے کر یہاں تک پہنچائیں کہ اس کا احصار قدرتِ بشری سے باہر ہو؟

(۲) ترکِ زیارت ائمہ کیساتھ ظلم و جفا ہے

امام جعفر صادق ؑ اور امام محمد باقر ؑ سے مختلف کلمات کے ساتھ مروی ہے کہ آپ امام حسین ؑ کی زیارت نہ کرنے والوں کو جفا کار قرار دیتے ہیں۔

ایک اور روایت میں فرماتے ہیں کہ :

" امام حسین علیہ السلام کی زیارت کو نہ چھوڑو،

اگر چھوڑو گے تو حسرت وندامت دیکھو گے جو ناقابل
معافی ہوگی۔"

(۳) زیارت کی راہ میں سب و شتم سننے والوں کے حق میں امامؑ کی دعا

معاویہ ابن وہاب نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے سنا کہ
وہ سجدہ میں یہ دعا فرما رہے تھے :

" خداوندا ! ہمارے دشمن نے قبر حسینؑ پر آنے
کے جرم میں ہمارے شیعوں پر نکتہ چینی کی اور
ان پر ملامت کی لیکن ان کی نکتہ چینی اور ملامت
شیعوں کو زیارتِ قبر حسینؑ سے نہ روک سکی۔
اور انھوں نے مخالفین کی مخالفت کے باوجود
زیارت کو جاری رکھا۔
خداوندا ! ان چہروں پر رحم فرما جنھیں آفتاب
کی تپش نے متغیّر کر دیا ہے۔
خداوندا ! تو ان پر اپنا رحم فرما جو اپنے چہرے
قبر حسینؑ پر رکھتے ہیں۔
خداوندا ! تو ان آنکھوں پر رحم فرما جن سے
ہمارے لیے اشک جاری ہوتے ہیں۔
خداوندا ! تو ان دلوں پر رحم فرما جو ہمارے لیے
درد و سوز رکھتے ہیں اور جو ہمارے لیے پریشان

رہتے ہیں۔

خداوندا! ان فریادوں اور آہوں پر رحم فرما جو ہمارے لیے بلند ہوتی ہیں۔

خداوندا! میں ایسی ہستیوں کو تیرے (رحم و کرم کے) سپرد کرتا ہوں۔"

اس کے بعد امامؑ نے معاویہ ابن وہاب سے فرمایا کہ:

"تم کیوں زیارت کے لیے نہیں جاتے ——؟"

معاویہ ابن وہاب نے کہا کہ:

"میں نہیں جانتا تھا کہ زائرِ حسینؑ کی منزلت اور مرتبہ اس قدر ہے!"

امامؑ نے فرمایا کہ:

"زیارتِ حسینؑ کرنے والوں کے لیے زمین سے زیادہ آسمان میں دعائیں کرنے والے ہیں۔"

(۴) حالتِ خوف میں زیارت بجا لانے کا اجر و ثواب

زرارہ نے امام محمد باقر علیہ السلام سے سوال کیا کہ:

"جو شخص آپ کے جد کی زیارت کے لیے حالتِ خوف میں جائے اس کے لیے کیا اجر ہے؟"

امامؑ نے فرمایا کہ

"قیامت کے دن اس کے لیے امن ہوگا۔ ملائکہ

اسس کو بشارت دیں گے کہ خوف نہ کر یہ دن
تیرے ہی لیے ہے۔

یہاں تک کہ امامؑ نے فرمایا:

" ہر وہ شخص جو ہمارے لیے حالتِ خوف میں
مرے گا خدا اسس کو اپنے عرش کے سائے میں
جگہ دے گا۔"

امام صادقؑ سے یونس ابن ظریان نے سوال کیا کہ:

" حالتِ تقیہ میں ہم آپ کے جد کی زیارت کریں
یا نہ کریں ـــــــ؟"

امامؑ نے فرمایا کہ:

" فرات پر جائیں، غسل کریں، پاکیزہ کپڑے پہنیں
اور قبر مطہر سے گزرتے وقت "السلام علیک
یا ابا عبداللہ" پڑھیں۔"

واضح رہے کہ یہ تمام اجر و ثواب اور زیارت کی فضیلت اس بات سے مشروط ہے کہ زیارت، معرفتِ امام حسین علیہ السلام کے ساتھ بجا لائی جائے جیسا کہ کتاب کامل زیارت میں منقول ہے۔

(۵) زیارتِ حسینؑ کی راہ میں ظلم و تشدّد برداشت کرنے والوں کا اجر و ثواب

امام صادقؑ سے سوال کیا گیا کہ:

" جو شخص امام حسین علیہ السلام کی زیارت کے

لیے جائے اور راستے میں اسیر ہو جائے اور اسیر
ہونے کے بعد وہ ظلم و تشدد کا نشانہ بھی بنے
اس کے لیے کیا اجر ہے ـــــــــــ ؟"

امامؑ نے فرمایا کہ :

"ہر وہ ضرب جو اس پر پڑتی ہے اس کے عوض اس کے لیے ایک حور ہے اور ہر اس تکلیف کے لیے جسے وہ برداشت کرتا ہے ایک لاکھ حسنات ہیں اور اس کے ایک لاکھ گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔"

⑥ زیارت امام حسینؑ کی راہ میں اسیر ہو جانے والوں کا اجر و ثواب

ہاشم ابن سالم نے امام صادقؑ سے سوال کیا کہ :

" جو شخص امام حسین علیہ السلام کی زیارت کے لیے جائے اور راستے میں گرفتار ہو کر قید خانے میں چلا جائے تو اس کے لیے کیا اجر ہے ؟"

امامؑ نے فرمایا کہ :

" اس کے ہر ایک دن کے لیے قیام قیامت تک ایک خوشی ہو گی۔"

⑦ زیارت امام حسینؑ کی راہ میں قتل ہو جانے والوں کا اجر و ثواب

صفوان جمال، امام جعفر صادق علیہ السلام سے سوال کرتے ہیں کہ :

"جو شخص آپؑ کے جد بزرگوار کی زیارت کو جائے
اور راستے میں ظالم حاکم کے ہاتھوں قتل ہو جائے
اس کے لیے کیا اجر، مقام اور مرتبت ہے؟"
امامؑ نے جواب دیا کہ:
"جبرائیل، ملک الموت اور ملائکہ اس
کے جنازے پر نماز پڑھتے ہیں اور اس کا حنوط
جنت سے ہوگا۔"
ایک اور روایت میں امامؑ فرماتے ہیں کہ:
"زیارت امام حسین علیہ السلام کی راہ میں جو
قتل ہو جائے اس کے خون کا پہلا قطرہ ہی اس
کی بخشش کا سبب بن جاتا ہے۔"

زیارت کے مضامین

ائمہ اطہارؑ کی تمام زیارتیں جو ان سے مربوط ہیں ان کے فقرات درج ذیل مطالب اور نکات پر مبنی ہیں:

○ —— ائمہ اطہار علیہم السلام آدمؑ سے لے کر خاتمؑ تک تمام انبیاء کرامؑ کے فضائل و کمالات اور مقاصد و اہداف کے وصی اور وارث تھے جیسا کہ اکثر زیارات خصوصاً زیارتِ وارثہ کے فقرات میں موجود ہے۔

○ —— ہمارے دینی اور دنیاوی تمام حوائج و مشکلات کا حل صرف

اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہم ائمہ اطہارؑ کی ذواتِ مقدسہ سے متمسک اور متوسل ہو جائیں۔

- دینِ مقدس کہ جس سے زائرین منسوب و مربوط ہیں، اس کی بقا کے لیے اس "مزور" (صاحبِ زیارت) نے طرح طرح کی تکلیفیں اور اذیتیں برداشت کی ہیں۔
- یہ مزور، اب نزدِ خدا حیات رکھتے ہیں اور زائر اپنے اس مزور کے بارے میں یہ اعتقاد رکھتے ہیں۔ زیارت کے فقرات زائر کو یہ بتاتے ہیں کہ مزور اب بھی اپنے زائر کا کلام سنتے ہیں اور اس کا جواب دیتے ہیں۔ جیسا کہ زیارت جابر انصاری سے واضح ہے۔
- اس امامؑ مزور کا خون ناحق جو بہایا گیا ابھی اس کا اس کے قاتل سے قصاص و انتقام باقی ہے۔ جیسا کہ زیارتِ ناحیہ مقدسہ کے فقرات سے واضح ہے۔
- ظالم و جابر حکام نے اس امامؑ پر جو مظالم ڈھائے وہ اس قدر ہیں کہ انھیں زمین و آسمان بھی برداشت نہیں کر سکتے۔
- نجات کا واحد راستہ انھیں ذواتِ مقدسہ سے تمسک ہے۔
- لعنت و نفرین ہو ان لوگوں پر کہ جنھوں نے ان ہستیوں کو ان کے مقام و منصب سے ہٹانے کے بعد انھیں ان کے خانہ و آشیانہ سے دور کیا، زندان میں ڈالا اور قتل کیا۔

- سعادت مند ہے وہ شخص جس نے ان ذواتِ مقدسہ کے لیے اپنے نفس کو قربان کیا اور خود کو ان کی صف میں شامل کر کے "انصار اللہ و انصار دین" کا لقب حاصل کیا جیسا کہ فقراتِ زیارت شہدائے کربلا سے واضح ہے۔
- شقاوت و بدبختی ان کے لیے ہے کہ جنھوں نے ان کو چھوڑ کر کسی اور کے در کو اپنایا۔
- اس مزور نے جو یہ مقام و منزلت اور عشق و محبت کا بلند ترین درجہ حاصل کیا ہے یا مومنین کے دلوں میں اپنے لیے وہ محبت پیدا کر دی ہے کہ جو زائرین کو اتنی صعوبتوں کے باوجود اس مزور تک کھینچ لاتی ہے وہ صرف اور صرف قربِ اطاعتِ الٰہی کے ذریعہ ہی حاصل کی ہے۔
- اس مزور نے امرِ معروف کو قائم کرتے ہوئے نماز و زکوٰۃ کی بقا کے لیے جہاد کرتے ہوئے راہ خدا میں خود کو شہادت کے لیے پیش کیا۔

زمان و اوقاتِ زیارت

سوائے حضرت امیر علیہ السلام کے کہ جن کی زیارت کے لیے رجب المرجب کی ۲۷ تاریخ اور روز غدیر مخصوص ہے۔ دیگر ائمہ طاہرینؑ امام زادگان جناب زہرا سلام اللہ علیہا حتیٰ کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی زیارت کے لیے کوئی خاص دن معین اور مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ ہمہ وقت زیارات کر سکتے ہیں

جبکہ امام حسین علیہ السلام کی زیارت کے لیے عام ایام کے علاوہ بھی کچھ ایام مخصوص و معین ہیں جن میں سے بعض ایام اگرچہ بظاہر زیارت امام حسینؑ سے مناسبت نہیں رکھتے ــــــــ!

سال کے تین سو ساٹھ دنوں میں سے کچھ ایام یوم اللہ ہیں اور فضیلت و مرتبت کے حامل ہیں۔

مثلاً ـــــــ پہلی رجب المرجب اور نیمۂ رجب کہ ان دو تاریخوں میں زیارت امام حسینؑ کی تاکید ہے۔ اور روایات میں زیارت امام حسین علیہ السلام خاص طور پر وارد ہوئی ہے۔

پندرہ شعبان المعظم کہ جو امام زمانہ عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کا روز ولادت ہے اور اس شب کی بیداری کی فضیلت میں کافی روایات وارد ہوئی ہیں لیکن یہ دن کہ جو امام زمانہؑ سے منسوب ہے اس میں امام حسینؑ کی زیارت کی خاص طور پر سفارش کی گئی ہے۔

رمضان المبارک کی انیس ۱۹، اکیس ۲۱ اور تئیس ۲۳ تاریخ کہ جو شبہائے قدر ہیں اور انھیں دنوں میں خداوند کریم نے اپنی معجز نما کتاب ہدایت قرآن کریم کو اپنے حبیب پیغمبر اکرمؐ پر نازل فرمایا۔ ان تاریخوں کی شبوں میں امام حسین علیہ السلام کی زیارت کی سفارش کی گئی ہے۔

شب و روز عید الفطر کہ یہ دن بھی یوم اللہ میں سے ہے۔ اس دن بندے اپنے قریب ترین دشمن یعنی نفس امارہ پر قابو اور فتح حاصل کرنے کی خوشی میں عید مناتے ہیں۔

شب و روز عرفہ کہ جو معرفت خدا، تضرع و زاری اور گناہوں کی مغفرت طلب کرنے کا دن ہے۔ ان مواقع پر بھی امام حسین علیہ السلام کی زیارت

کی خاص طور پر سفارش کی گئی ہے۔

شب و روز عیدِ قربان وہ موقع ہے کہ جب فرزندانِ توحید سنت ابراہیم خلیل اللہ کی تأسی میں خوشنودیٔ خدا کی خاطر ہر قسم کی قربانی کے عزم کا اظہار کرتے ہیں۔ اس دن کے لیے بھی امام حسین علیہ السلام کے لیے خاص زیارت وارد ہوئی ہے

شبِ عاشور اور شب و روز اربعین (یعنی ۲۰ صفر المظفر) تعارف اور توضیح کے محتاج نہیں ہیں۔ ان شب و روز میں بھی امام حسین علیہ السلام کی زیارت کی تاکید کی گئی ہے۔

لمحۂ فکریہ

ہم قارئین کرام کی توجہ اس بات کی طرف مبذول کرانا ضروری اور لازمی سمجھتے ہیں کہ ہمارے ائمہ اطہار سلام اللہ علیہم اجمعین، پیغمبر اکرمؐ سے لے کر امامِ زمانہؑ تک سب کے سب نور واحد اور حقیقت واحدہ ہیں جیسا کہ زیارتِ جامعہ کے فقرات میں موجود ہے کہ:

" آپؑ سب کے اسمائے گرامی، اجسادِ مطہرہ
اور آپؑ کی ارواح مقدسہ اور قبورِ مطہرہ
ایک دوسرے میں ضم ہیں۔"

یعنی معصومین علیہم السلام کے اسمائے گرامی علیحدہ نہیں بلکہ اولنا محمد واوسطنا محمد واخرنا محمد وکلنا محمد

کے مصداق ایک دوسرے کے مظہر ہیں۔

ان کے جسم ہائے مبارک بہ ظاہر جدا ہیں لیکن یہ ایک دوسرے کے جسم کے ٹکڑے ہیں۔ ان کی ارواح مطہرہ ایک ہیں۔

ان کے روضہ ہائے مبارک گو بظاہر مختلف گوشہ وکنار میں ہوں لیکن حقیقت میں ایک دوسرے سے متمسک و متوسل ہیں گویا ہر ایک روضہ اپنی جگہ تمام معصومین؏ کا مظہر اور تجلی گاہ ہے۔

اس حقیقت کو تسلیم کر لینے کے بعد کہ ائمۂ اطہار؏ فضیلت و مرتبہ اور درجہ کے لحاظ سے سوائے پیغمبر اکرم ﷺ اور امیر المومنین؏ کے سب برابر اور مساوی ہیں آخر کیوں صرف قبر حسین؏ کی زیارت کی طرف زیادہ توجہ مبذول کراتے ہیں اور تاکید فرماتے ہیں؟ :

○ —— اگر زیارت کا مقصد صرف ائمۂ اطہار علیہم السلام سے ولایت و محبت کا مظاہرہ کرنا یا اظہار عقیدت کرنا ہوتا تو پھر اسے اس انداز سے ہونا چاہیئے تھا کہ جو شخص جس امام؏ کے روضۂ مطہر سے نزدیک ہو، اسی امام؏ کی بارگاہ پر حاضری دے کر زیارت کرے۔ لیکن اس کے برعکس ائمۂ اطہار؏ نے اپنے ہر دوستدار اور موالی کے لیے زیادہ تر ایک ہی زیارت گاہ صرف روضۂ امام حسین؏ کو مرکز اور محل اجتماع قرار دینے کی تلقین فرمائی ہے چاہے وہ روضۂ حسین؏ سے کتنی ہی دُور اور فاصلہ پر رہتا ہو۔ آخر کیوں ——؟

○ —— ان مخصوص ایام میں کہ جن کا تذکرہ ہم نے گزشتہ سطور میں کیا کچھ ایسے ایام ہیں جو بظاہر دوسرے ائمۂ اطہار؏ سے زیادہ

نسبت رکھتے ہیں۔ مثلاً شب نیمۂ شعبان کہ جو امام زمانہؑ
سے منسوب ہے یا شب ہائے قدر کہ جو پیغمبر اکرمؐ سے زیادہ
مناسبت رکھتی ہیں کیونکہ ان راتوں میں پیغمبر اکرمؐ پر نزول قرآن
ہوا۔ یا پھر یہ شبیں امیر المومنین علیہ السلام سے زیادہ
نسبت رکھتی ہیں کہ ان ایام میں آپؑ کو ضربت لگی اور آپؑ
شہید ہوئے یا پھر امام زمانہؑ سے۔
یا مثلاً شب ہائے عید الفطر و عید قربان کہ یہ رمز بندگی
اور عبودیت کا مظاہرہ کرنے کے دن ہیں ان کو رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا امام وقت سے بظاہر مربوط ہونا
چاہیے یا پھر مثلاً روز عاشورہ و اربعین کہ جو اگرچہ امام
حسین علیہ السلام سے زیادہ نسبت رکھتے ہیں لیکن عرض
تعزیت کرنے کے لحاظ سے یہ دونوں دن بھی رسول اکرمؐ اور
امیر المومنینؑ سے مناسبت رکھتے ہیں۔ لیکن ان ایام میں زیارات
اگر مخصوص ہیں تو امام حسین علیہ السلام سے۔ آخر کیوں؟
ان حقائق و ہدایات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اگر ہم غور و فکر کریں تو
یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ:
جس طرح خانہ کعبہ دشمنانِ اسلام سے اظہار نفرت و بے زاری کا مرکز
ہے اسی طرح امام حسینؑ کی قبر مطہر بھی دشمنان اہلبیت سے اظہار نفرت و بیزاری
اور ائمہ طاہرینؑ سے اظہار ولایت و مودت اور اعلان وفاداری کی جگہ ہے۔
اسی بنا پر طول تاریخ میں عزاداری حسینؑ اور حرم حسینی کو حکمرانوں کی جانب
سے نقصان پہنچانے کی مذموم کوششیں ہمہ وقت جاری رہیں۔ ہر دور کے حکمرانوں

نے تہدید و تعذیب کے ذریعہ عزاداری حسینؑ اور قبر حسینؑ کی زیارت بند کرانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔

نہ صرف یہ بلکہ جب ہر قسم کے ظلم و ستم اور قتل و غارت کے باوجود زیارتِ قبرِ حسینؑ کا سلسلہ بند نہ ہوا اور حسینی پروانے تمام مصائب جھیلتے ہوئے اس شمع کے گرد محوِ طواف رہے تو حکام نے اپنے ظلم کی انتہا کر دی اور اس مرکزِ ہدایت، قبرِ مطہر حسینؑ کو منہدم کرنے کا فیصلہ کر لیا اور مختلف حکمرانوں نے کئی مرتبہ قبرِ مطہر حسینؑ کو منہدم کیا جس کا مختصراً جائزہ ذیل میں ملاحظہ فرمائیں۔

ہادمِ قبرِ مطہر امام حسین علیہ السلام

○ —— سب سے پہلے جس نے قبر مطہر امام حسین علیہ السلام پر دستِ خباثت اور دست خیانت دراز کیا وہ خلیفۂ منصور دوانیقی تھا۔ اس کی غیر اسلامی حرکتوں سے ابوحنیفہ اور مالک بن انس نے اس کے ساتھ کی جانے والی بیعت کو خلافِ شرع قرار دیا۔

○ —— دوسرا جابر اور ظالم عباسی خلیفہ ہارون الرشید تھا جس نے قبرِ مطہر امام حسینؑ کو خراب کیا اور وہاں موجود درخت سدرہ کہ جسے زائرین امام حسین علیہ السلام سائے کے لیے استعمال کرتے تھے کٹوا دیا اس درخت کو اکھاڑنے والے پر پیغمبر اکرمؐ نے لعنت فرمائی تھی۔ اس ظالم و جابر عباسی خلیفہ نے زائرین کو قبر مطہر پر جانے سے بھی روکا۔

○ —— تیسرا شخص متوکل عباسی تھا جو شراب خور اور فاجر تھا۔

اس نے چار مرتبہ قبر مطہر کو خراب کیا اور ہل چلایا اور نہر فرات کے پانی کے رخ کو قبرِ مطہر کی طرف کیا۔ اس نے ۲۳۳ ہجری ۲۳۶ ہجری اور ۲۴۷ ہجری میں قبر مطہر کی جو ہتک کی اور زائرین امام مظلوم پر جو ظلم اور مصائب ڈھائے ان سے تاریخ کے صفحات سیاہ ہیں۔

○ —— ۱۲۱۶ھ ہجری میں چوتھا شخص جس نے اس قبر مطہر کی طرف دست خباثت اور دستِ نجاست بڑھایا وہ عبدالعزیز ابن محمد ابن آل سعود تھا۔ اور اسی شخص نے مدینہ میں جنت البقیع میں ائمہ علیہم السلام کی قبور مطہرہ اور مکہ میں قبر مطہر ام المومنین خدیجۃ الکبریٰ سلام اللہ علیہا اور قبر مطہر حضرت ابو طالبؑ کو بھی ویران کیا۔

تتمہ

ائمہ اطہار علیہم السلام کا قبرِ مطہر امام حسین علیہ السلام کی زیارت ان کے ذکر مصائب اور عزاداری کو احیائے امر ائمہؑ سے تعبیر کرنا اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ وہ امام حسین علیہ السلام کو مرکز توجہ بنا کر ظلم و استبداد کے خلاف قیام کرنے کی دعوت دینا چاہتے تھے۔ ورنہ ائمہ اطہارؑ میں سے ہر ایک کو دوسرے سے زیادہ مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔

مثال کے طور پر امام حسن علیہ السلام کے بیس سالہ دور کو دیکھیں کہ آپ نے کن شدید مصائب کا سامنا کیا اور ایسے حالات پیش آئے کہ جب معاویہ سے صلح پر آپ کے دوست اور دشمن دونوں ہی آپ کو مورد الزام ٹھہراتے تھے ۔

معاویہ اور بنی امیہ کے خطبا ر آپؑ ہی کے حضور آپ کے والدِ گرامی پر سب وشتم کرتے تھے۔ یہاں تک کہ آپؑ کی شہادت کے بعد آپؑ کے جنازے پر تیروں کی بارش کی گئی۔ یا پھر امام سجادؑ کی مثال لے لیں کہ آپؑ نے وہ مصائب و آلام برداشت کیے کہ جو خود امام حسین علیہ السلام کے لیے ناگوار تھے۔

آپ کے اس چوتھے امامؑ نے آیۂ تطہیر کے مصداق خاندان کی مخدراتِ عصمت وطہارت اور دخترِ زہرا سلام اللہ علیہا زینب کبریٰ کو فسق وفجور اور لہو ولعب کی مجلسوں میں رسیوں سے بندھے ہوئے یزید کے دربار میں کھڑے ہوئے دیکھا۔

اسی طرح امام موسیٰ ابن جعفرؑ کی مثال ہمارے سامنے ہے کہ آپ چودہ سال تک ہارون الرشید کے زندانوں میں رہے۔ اور زندان ہی سے آپ کا جنازۂ مطہر اس حال میں نکالا گیا کہ آپ کے ہاتھوں میں زنجیریں اور پیروں میں بیڑیاں تھیں اور تین روز تک جسرِ بغداد پر آپؑ کے جنازے کو رکھا گیا۔

اسی طرح ہمارے تمام ائمہؑ طرح طرح کے مصائب اور مظالم کا سامنا کر کے دنیا سے رخصت ہوئے۔ چنانچہ جناب زہرا صلوات اللہ علیہا اپنے پدر بزرگوار سے خطاب کرتے ہوئے فرماتی ہیں کہ:

"بابا! آپؐ کے بعد ہم پر اتنی مصیبتیں پڑیں کہ اگر یہ مصیبتیں دن پر نازل ہو جاتیں تو دن تاریک راتوں میں بدل جاتے۔"

اگرچہ ہر امامؑ پر مصائب و آلام کا ایک پہاڑ ٹوٹا لیکن اس کے باوجود ائمہ اطہارؑ جیسی ہر خطا اور لغزش سے پاک و منزّہ ہستیوں کا صرف امام حسین علیہ السلام ہی کو مرکزِ توجہ بنانا حکمت و فلسفہ سے خالی نہیں ہے۔

دراصل ائمہ اطہار علیہم السلام لوگوں کی توجہ امام حسین علیہ السلام کی طرف مبذول کرا کے ذکر حسینؑ کو استعمار و استکبار کے خلاف بطور حربہ استعمال فرماتے تھے۔

سید الشہداءؑ کے اسم مبارک کے توسل سے ائمہ اطہارؑ، استعمار، بربریت اور ظلم کے خلاف لوگوں کے دلوں میں نفرت پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ امام سجادؑ خود لوگوں سے ایسے سوال پوچھتے تھے اور ایسے مواقع فراہم کرتے تھے کہ امام حسینؑ کا ذکر ہو۔ اور حسینؑ کو یاد کیا جائے تاکہ مظلوم کربلا کے ذکر کے توسط سے لوگوں کے دلوں میں ظالم کے خلاف نفرت پیدا ہو۔

ائمہ اطہار کی ان کوششوں اور مساعی کے نتیجہ میں حسینؑ کا نام، استکبار اور ظلم و بربریت کے خلاف ایک نعرہ اور شعار بن چکا تھا جو آج بھی ہے۔

امام حسین علیہ السلام کا قیام فقط یزید کے خلاف نہیں تھا بلکہ پورے استعمار اور استکبار کے خلاف تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اس وقت استعمار یزید کی شکل میں نمودار ہوا اور آج بھی وہی استعمار کسی دوسرے لباس میں آ کر دو پہلوؤں سے حملہ آور ہو رہا ہے۔

ایک طرف تو اس استعمار کی ہر ممکن کوشش یہ ہے کہ یہ تاثر عام کیا جائے کہ حسینؑ کا قیام گزرے ہوئے کل کے یزید اور اس کے ماننے والے ایک گروہ کے خلاف تھا۔

دوسری طرف اس کی بھرپور کوشش یہ ہے کہ لوگ رسمی طور پر ایک سالانہ تقریب کی حیثیت سے حسینؑ کی یاد منائیں اور ان کا ذکر کریں۔ لیکن استعمار کے خلاف قیام کرنے کی جو فکر حسینؑ نے دی تھی وہ لوگوں کے ذہنوں میں نہ آنے پائے استعمار کی یہ کوشش ہے کہ یہ باور کرایا جائے کہ نظریہ حسینؑ آج

اور آنے والے کل کے استعمارگروں سے قطعی متصادم نہیں ہے۔ جبکہ حسینؑ نے اس وقت مجسمۂ استعمار کے خلاف قیام کر کے اپنا خون، اپنا وجود اور اپنا سب کچھ دے دیا اور بعد میں آنے والے ائمہؑ نے نام حسینؑ اور ذکر حسینؑ کو اس وقت کے طاغی اور استعمارگروں کے خلاف بطور حربہ استعمال کیا۔

ذرا غور کیجیے!

اگر حسینؑ ہر دور کے استعمار کے خلاف نہ ہوتے تو پھر ہر دور کے استعمار نے قبرِ حسینؑ کو کیوں بار بار مسمار کیا؟ اور آج بھی حسین سے منسوب مراکز ان کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتے ہیں۔

آج ہمارے ملک میں قادیانیوں کی املاک اور سازش گاہوں کو تحفظ حاصل ہے۔ جبکہ وہ مسلمانوں کے اور اسلام کے بدترین دشمن ہیں۔

آغاخانیت جو استعمار کی نمائندہ ہے ملک بھر میں اقتصادی منصوبہ بندی کے نام سے ان کو نہ صرف مسلمانوں کو منحرف کرنے کی کھلی اجازت ملی ہوئی ہے بلکہ بڑی گرم جوشی سے آغاخانیت کا استقبال کیا جا رہا ہے۔

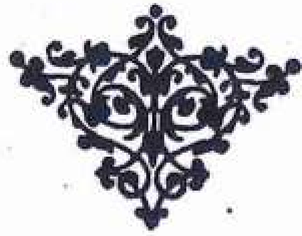
کمیونزم جیسے الحادی نظریات رکھنے والوں، بہائی، پرویزی، سکھ، اور ہندوؤں کی املاک اور ان کی مذہبی رسومات کو مکمل تحفظ حاصل ہے اور انھیں کوئی خطرہ لاحق نہیں۔

اگر اس ملک میں کوئی خطرہ لاحق ہے تو صرف ذکر مصائب حسینؑ یا حسین سے منسوب مراکز کو۔

مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ ان استعماری عناصر کو خود پہچانیں اور لوگوں کو بھی اس سے روشناس کرائیں۔ یہ انصاف نہیں ہے کہ استعمار کی بربریت کے ناپاک عزائم کی مذمت کرتے وقت ملک میں رہنے والے دوسرے مسلمانوں کو بھی

اس مذمت کی لپیٹ میں لے لیا جائے اور ان کو بھی ان کے ساتھ موردِ الزام ٹھہرائیں کیونکہ ایسے جرائم کا ارتکاب کرنے والا اس ملک کا ایک اقلیتی گروہ ہے جس نے یہاں استعمار کے مفادات کا تحفظ کرنے اور ان کی نمائندگی کرنے کے لیے خود کو فروخت کیا ہوا ہے۔

آخر میں ہم تمام دوستدارانِ اہلبیت اطہارؑ سے اور خاندانِ رسالت سے عشق و محبت رکھنے والوں سے التماس کرتے ہیں کہ اگر کوئی شخص یا گروہ استعمار و استکبار اور ظلم و بربریت کے خلاف آواز اٹھانا چاہتا ہے تو اسے چاہیے کہ وہ تمام ائمہ اطہار علیہم السلام کی سیرت طیبہ کو سامنے رکھ کر دورِ حاضر میں اپنی ملت کی ذہنی اور فکری سطح کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے کوئی قدم اٹھائے اور ساتھ ہی استعمار کے تمام مکر و فریب اور چاپلوسیوں پر نظر رکھے اور اس بات کو ذہن نشین رکھے کہ دائیں اور بائیں دونوں گمراہی کے راستے ہیں۔ خدا کی طرف جادۂ مستقیم فقط خطِ ائمہ اطہارؑ ہے۔ ان سے آگے ہونا اور ان سے پیچھے رہ جانا ہلاکت اور نابودی کا باعث ہے۔ ائمہ اطہارؑ ہی قطب رحیٰ اور نقطۂ ارتکازِ کائنات ہیں۔



اتحادِ ملّتِ مسلمہ کی ایک سنجیدہ کوشش

علامہ محمد مہدی الآصفی کی گرانقدر تالیف

فلسفۂ امامت

جس میں امامت کے مفہوم کو جدید علوم کی روشنی میں

سادہ وسلیس پیرائے میں بیان کیا گیا ھے

سیاست اور حکومت کے سلسلہ میں امام کے مقام کو واضح کیا گیا ہے مسئلہ امامت پر ملتِ اسلامیہ کے مختلف فرقوں کے مابین اختلاف کے اسباب بیان کیے گئے ہیں اور اسلامی فرقوں کو مفہوم امامت کے سلسلہ میں ایک دوسرے سے قریب لانے کی کوشش کی گئی ہے

قیمت ۲۵/ روپے

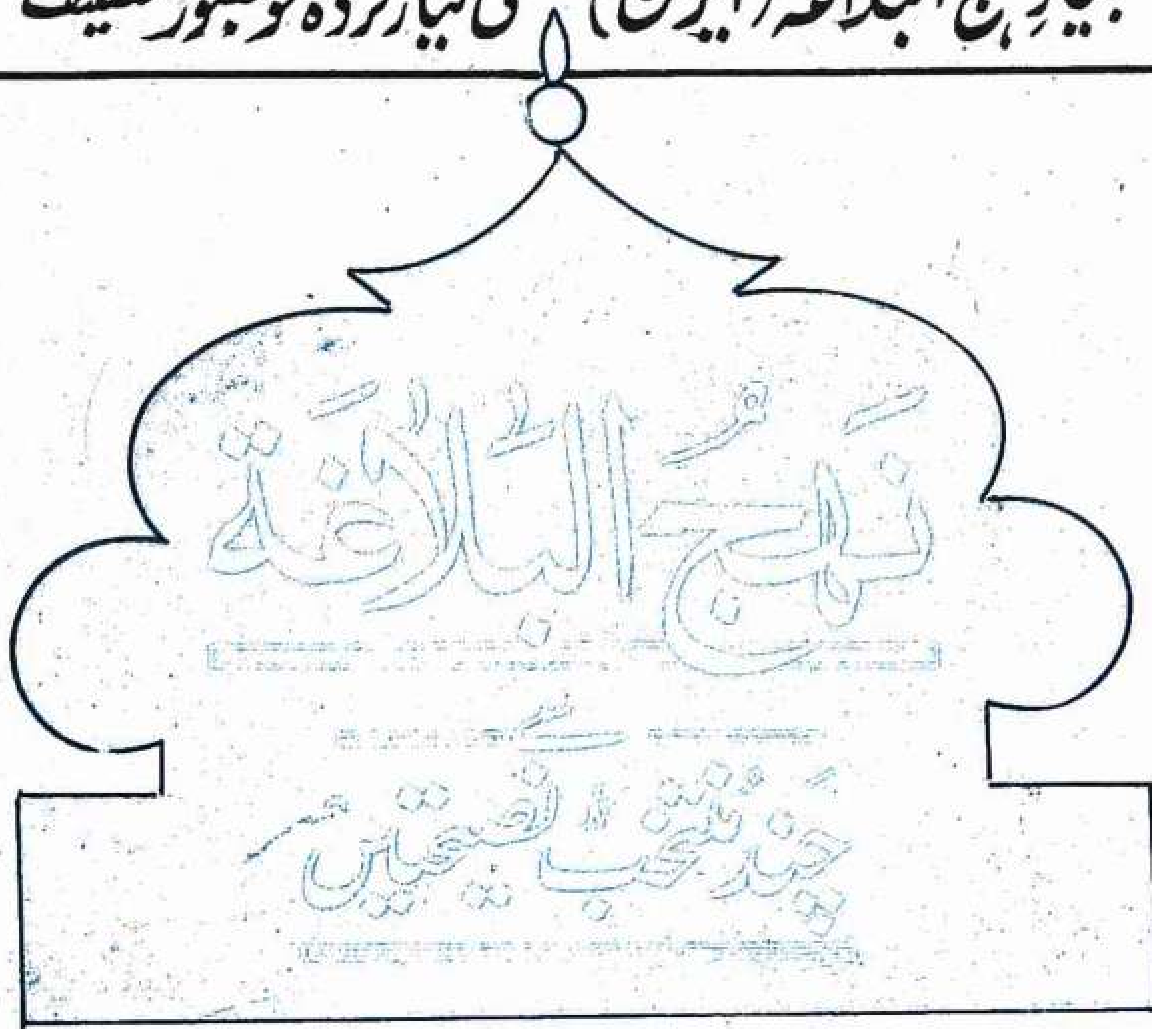
آفسٹ طباعت


دار الثقافة الاسلامیة
١٤٠٣ھ
کراچی پاکستان


دار الثقافة الاسلامية
١٤٠٢ھ
کراچی پاکستان

طلبہ اور نوجوانوں کے لیے گراں بہا تحفہ

بنیادِ نہج البلاغہ (ایران) کی تیار کردہ خوبصورت تصنیف



فاضل مصنّفین کے رشحاتِ قلم سے مزیّن ایک

باوقار تالیف

جس میں امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السّلام

کی زبانِ مبارک سے ادا شدہ

منتخب کلمات کی نہایت عمدہ اور سلیس تشریح و توضیح کی گئی ہے

عمدہ کتابت	دیدہ زیب سرورق	اعلیٰ طباعت	قیمت /25 روپے

Rs 30.00